مترجمہ

محمد سرفراز علی نیوش (عثمانیہ)

(حیدآبادی)

مرتبہ

جی۔ بی۔ ہائیڈ اور سی۔ بی۔ وھیلر

(مترجمہ)

محمد سرفراز علی صاحب۔ نیوش (حیدرآبادی) کلیہ جامعہ عثمانیہ

(ناشر)

سید عبدالقادر تاجر کتب و پبلیشر چار مینار حیدرآباد دکن

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

انتساب

میں اپنے اس ناچیز ترجمہ کو میرے شفیق و محترم پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ کے نام نامی پر معنون کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں جن کی مخلصانہ حوصلہ افزائیوں نے مجھ میں ادبی کاوشوں کی سرانجامی کی قوت عطا فرمائی ۔

محمد سرفراز علی ہوش (حیدرآبادی)
کلیہ جامعہ عثمانیہ

عثمان شاہی

۲۵ر اسفندار ۱۳۴۳ ف

فہرس

احوالِ واقعی

خدائے بزرگ و برتر کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میری کوششوں کو "سعی مشکور" ہونیکا شرف بخشا۔ اور اُسی کی ذات بابرکات سے توقع ہے کہ یہ حقیر ادبی خدمت قوم و ملک میں بہ نظرِ استحسان دیکھی جائے گی۔

ترجمہ خواہ کسی زبان کا ہو اس میں وہ خوبی اور لطافت ہرگز نہیں آسکتی جو ندرت کہ اسکی حقیقی زبان میں ہوتی ہے۔ ترجمہ میں ادائیگی مفہوم۔ مناسب اور برموقع الفاظ۔ سلاست زبان شستگی محاورات۔ شگفتہ تراکیب۔ برجستگی فقرات۔ غرض کہ ان تمام اوصاف کا خیال رکھنا ازبسکہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس کی دقتوں کا اندازہ کچھ وہی اصحاب بخوبی کرسکتے ہیں جن کو کہ کبھی ایک سطر بھی بامحاورہ ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔ میں نے بعض پیچیدہ مقامات کو صاف اور سلیس پیرایہ میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور تلمیحات و تصریح طلب اجزاء کی جابجا "فٹ نوٹ" میں وضاحت بھی کردی ہے۔

اس کے علاوہ چونکہ "گولڈ اسمتھ" کے یہ فرضی خطوط جو انگریزی ادب میں ایک خاص وقعت اور حیثیت کے مالک ہیں۔ اور یہ زیادہ تر اس اعتبار سے مشہور ہیں کہ ان کے ذریعہ سے اُس نے اپنے زمانے کی معاشرت۔ اخلاق۔ اور علمی مذاق پر ظرافت آمیز۔ طنز کرکے اسکی اصلاح کی کوشش کی تھی۔ اس لئے ممکن ہے کہ۔ یہ ترجمہ علاوہ طلباء انٹرمیڈیٹ کے جنکے نصاب میں اصل خطوط جو کہ "گولڈ اسمتھ" کی مشہور کتاب "سیٹزن آف دی ورلڈ"[1] سے

---

[1] "CITIZEN OF THE WORLD.

منتخب کیئے گئے ہیں اور ان کے نصاب میں داخل ہیں۔ اس کے ماسوا بھی عام علمی مذاق رکھنے والے حضرات کے لیئے بھی دلچسپی کا سامان بن سکے گا۔ گو اس سے انکار نہیں ہے کہ وہ طنز اور ظرافت جو اصل خطوط کی جان ہے اُردو میں کما حقہٗ ادا نہیں ہوسکتی۔ پھر بھی ان خطوط کی ادبی شہرت اور ان کا مصلحانہ مقصد اس کی کافی سفارش تھی کہ اُردو ادب کا دامن ان سے خالی نہ رہنے پائے۔

مجھے اپنی ہیچمدانی کا اعتراف ہے اس باب میں میری بساط "حباب اسا" بھی نہیں ہوسکتی۔ مگر پھر بھی میں نے کوشش اس امر کی۔ کی ہے۔ کہ ترجمہ میں کافی دلچسپی پیدا ہو سکے۔ اور اگر قارئین کرام نے اس کی ایک سطر کو بھی بہ نظر پسندیدگی دیکھا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے ہوئی۔

کچھ تو امتحان کی قربت کے لحاظ سے اور کچھ گوناگوں مصروفیات کی بنا پر اس "ایڈیشن" میں بہت عجلت سے کام لیا گیا ہے۔ اگر کوئی سقم ناظرین کے احاطہ خیال میں آئے تو از راہ علم نوازی اُس کو نظر انداز کر دیں آیندہ "ایڈیشن" میں انشاء اللہ تعالیٰ بہت غور و خوض کے ساتھ اس کی پابجائی کر دی جائیگی۔

یہ میری ناشکر گذاری ہو گی کہ میں اپنے محترم اور معزز پروفیسر سید عبدالقادر سروری۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) پروفیسر اُردو کلیہ جامعہ عثمانیہ کا شکریہ نہ ادا کروں۔ صاحب موصوف ہمیشہ میرے مسودوں اور جملہ ادبی تفکرات کو نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے ملاحظہ فرما کر اپنے قیمتی مشوروں سے بہرہ ور فرماتے رہتے .... ہیں۔ جن کا میں بے حد ممنون ہوں۔

سب سے آخر میں اپنے مشفق و محبی عنایت فرما میرزا زاہد علی صاحب کامل کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپکے بے پناہ تقاضوں اور بار بار کی خلوص کی تاکیدوں نے مجھے اس کام کے اتمام کی طرف توجہ دلائی۔ جس کا میں بہ دل مشکور ہوں۔

محمد مرزا زعلی نیوتن (حیدرآبادی) کلیہ جامعہ عثمانیہ
عثمان شاہی

رائے

"گولڈ اسمتھ" کے خطوط انگریزی ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اکثر و بیشتر جامعات میں انگریزی زبان و ادب کے تعلیمی نصاب میں شامل ہیں۔ ان کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا اس زبان کی حقیقی خدمت ہے۔ کیونکہ یہاں ناولوں۔ افسانوں اور ڈراموں وغیرہ کے ترجمے ہماری زبان کے ادبی ذخیرہ میں اضافہ کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ دیگر اصناف ادب سے بھی اردو کے دامن کو مالا مال کیا جائے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جبتک سنجیدہ علوم و فنون اور اصلی زندگی سے متعلق انگریزی تحریروں کے وافر ترجمے اردو میں منتقل نہ ہونگے ہمارے تعلیمی اور ادبی ذوق کی اصلاح و ترتیب نہ ہوسکے گی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس اہم ضرورت کی تکمیل کا خیال ہماری جامعہ کے ایک قابل متعلم مولوی محمد سرفراز علی صاحب نیوش (حیدرآبادی) کے ذہن میں پیدا ہوا۔ اور انہوں نے نہایت خوبی کے ساتھ اس کو سر انجام کیا۔

مسٹر نیوش اردو کے اچھے طالب علم اور باذوق مضمون نگار ہیں۔ اب تک انکے متعدد مضامین۔ افسانے۔ ڈرامے۔ اور مختلف نوع کے ترجمے میری نظر سے گذر چکے ہیں۔ اور ہندوستان و دکن کے رسائل میں شائع بھی ہوچکے ہیں۔ ایک ایسے لائق شخص کے ترجمے میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں میں سمجھتا ہوں وہ سب اسکی زیر نظر کتاب میں جمع ہو گئی ہیں۔ "گولڈ اسمتھ" کے مخصوص ظریفانہ انداز کو اردو میں برقرار رکھنا اور پھر اردو کی سلاست و نزاکت کو باقی رکھنا ایک پختہ مشق قلم ہی کا کام ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ محمد سرفراز علی صاحب نیوش (عثمانیہ) نے نہایت کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ جس پر میں انکو دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔

سید محی الدین قادری زور۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)
پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن (۲۷ر اسفندار ۱۳۴۲ف)

رائے

"گولڈ اسمتھ" انگریزی ادب کی بڑی نمایاں شخصیت ہے۔ اس کے مشہور ناول "ویکار آف ویکفیلڈ" کے اردو میں ابتک کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ جن میں سے ایک ترجمہ انگریزی ناولوں کے اردو ترجموں میں اولین ہے۔ اس کے خطوط بھی انگریزی ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ خطوط یوں بھی دلچسپ ترین ادب سمجھے گئے ہیں "پھر گولڈ اسمتھ" کے خاص انداز بیاں نے ان میں جو دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ وہ ان ترجمے کے دیکھنے سے ظاہر ہوگی۔

محمد سرفراز علی صاحب تپش (حیدرآبادی) متعلم جامعہ عثمانیہ جنہیں ادب سے خاص ذوق ہے۔ انگریزی زبان کے ان اہم خطوط کو اردو میں ترجمہ کر کے بڑا مفید اور دلچسپ کام کیا ہے۔ یہ ترجمہ نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی جماعت انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں یہ خطوط شریک ہیں۔ بلکہ عام اردو خواں بھی انہیں ناول کی طرح دلچسپ پائینگے۔

مسٹر تپش نے یہ ترجمہ نہایت سلیقہ اور صفائی سے کیا ہے۔ اصل کا انداز بیان۔ اس کی ظرافت ترجمے میں بھی حتی الامکان قایم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ ترجمہ طلبہ کے لئے ایک ضروری اور عوام کے لئے فرصت کے اوقات کا ایک بہترین مطالعہ ہوگا۔

عبدالقادر سروری یم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (عثمانیہ)
پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا خط۔

ایک خواب

شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہوگا کہ جبکہ عہد ماضی کے ممتاز شعرا مثلاً
ڈرائیڈن، "پوپ" اور دوسروں پر کوئی نہ کوئی نکتہ چینی نہ کرتا ہو۔ مشکل سے
کوئی مہینہ خالی جاتا ہوگا۔ جبکہ ان لوگوں پر کوئی نہ کوئی دل آزار تنقید
نہ ہوتی ہو۔ تعجب ہے! کہ ہمارے نقاد اُن لوگوں پر اپنی اظہار مہربانی کرتے
ہیں جو کہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اور اپنی مخالفت اُن لوگوں پر
ظاہر کرتے ہیں۔ جن کو زندہ انسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں
پر جب اعتراضات ہوتے ہیں تو وہ لوگ بھی ان کا جواب دیتے ہیں۔ جن سے
بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور احساسات مجروح ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ
موجودہ زمانے کے مصنفین اپنے پیش روں کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے۔
لیکن یہہ ایک اخلاق ہے کہ ہم اُن کو لائق اور سنجیدہ خیال کرتے ہیں۔ ہم
جس قدر بھی اُن کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ وہ اُن کی بساط سے۔

بہت زیادہ ہوتی ہے جس کے وہ شمہ برابر بھی مستحق نہیں ہوتے۔ اگر ایک قبول صورت خاتون کے حسن و جمال کی تعریف کی جائے تو وہ بھی سمجھتی ہے کہ میری خوبصورتی کی تعریف کرنا لوگوں کا فریضہ ہے۔ چنانچہ ہزاروں آدمیوں سے وہ اپنی تعریف سنتے سنتے آخر میں وہ اس تعریف سے بے پرواہ ہو جاتی ہے۔ اور ان خوش آئند الفاظ پر کان دھرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اسی طریقہ سے اگر ایک معمولی شکل و شباہت کی عورت کو یہ یقین دلایا جائے کہ وہ اپنے حسن میں لاثانی ہے۔ تو وہ اپنا تمام دن اپنے حسن کی آرائش و زیبائش میں صرف کر دے گی۔ اور یہ خوشامد اس کے لئے مضر وقت ثابت ہو گی۔ وہ تعریفات جن کو ہم باموقع اور بجا خیال کرتے ہیں۔ اُن کو ہم یونہی مستعاراً قبول کرتے ہیں۔ وہ بھی کسی قدر تامل کے ساتھ۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو اس قدر تعریف و توصیف کا مستحق نہیں سمجھتے۔ جب اُن کی تعریف کی جاتی ہے اور اُن کو اُن کی لیاقت کا احساس کرایا جاتا ہے۔ تو وہ عددرجہ ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ہماری اس مہربانی کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح سے کہ گویا ہم نے اُن پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

ہمارے وہ معززین جو کبھی "جلسہ تقسیم شہرت ادبی" کے صدر بنائے جاتے ہیں۔ تو وہ لوگ اکثر انصاف اور کشادہ دلی کے مطمح نظر کو بالائے طاق رکھکر بیجا تعریفات پر اتراتے ہیں۔ اور اکثر یہی خیال کرتے ہیں کہ جس وقت بھی ہمارے ہاتھ میں قلم آئے گا تو ہم ہمیشہ

شہرت و عزت کی بیخ کنی کیا کرینگے۔ اور ہر ممکنہ طریقے سے موجودہ عہد کے شعراء کو مشہور نہ ہونے دینگے۔ اس کو تو اول خیال کرنا چاہئے کہ آج کل کی ادبی دنیا یوں ہی کمزور ہو رہی ہے۔ اس قدیم زمانے کی طرح نہیں۔ جبکہ آپس کی نوک جھوک ایک دوسرے پر ادبی اعتراضات سرمایہ ادب میں کافی اضافہ کرتے تھے۔ لیکن موجودہ صورت یہ ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں قلم آجاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو لائق مصنف یا کسی وجہ کے خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ لوگ ذاتی مفاد کو ادبی فائدے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اپنی خود ساختہ تعریف کے نقرات کو اپنی جاودانی شہرت کا محافظ خیال کرتے ہیں۔

ان تمام تاثرات کا احساس کرتے ہوئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ عوام کو بھی اس شہرت کے حصے میں شریک کیا جائے۔ چنانچہ میں نے ایک فرضی سفر شہرت اختیار کیا ہے۔ اور اس کی ابتدا میں نے ایک خواب سے کی ہے۔ جس میں نہ تو تلمیحات ہی قابل اعتنا ہیں۔ اور نہ خواب ہی کی کچھ اصلیت ہے۔

عالم رویا۔ میں ایک دن میرا گزر ایک راستے میں ہوا۔ جہاں بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کئی آدمی جگہ کی انتظار میں اور چند سامان بار کرنے کی فکر میں کھڑے تھے۔ وہاں ہر گاڑی پر اس کے مقام مقصود کا پتہ درج تھا۔ ایک پر میں نے "گاڑی حسرت" لکھا دیکھا دوسری پر "گاڑی صنعت" تیسری پر "خیال خودبینی" اور چوتھی پر "گاڑی

برائے امیر و کبیر" لکھا تھا۔ میرا دل چاہا کہ ہر گاڑی پر کم سے کم ایک مرتبہ تو ضرور بیٹھوں ۔ اور یہ وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میں نے سب کو نظر انداز کر کے ایک چھوٹی "برلن فیشن" کی گاڑی کو کیوں پسند کیا جس کو میں تمام دنیا کی آرام دہ گاڑیوں سے بہتر سمجھ رہا تھا۔ جب میں اُس کے قریب پہونچا تو اُس پر میں نے "گاڑی شہرت" لکھی دیکھی ۔ اتفاقیہ طور پر میری نظر کوچبان پر پڑی۔ جو بشرے سے تو نیک آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ ابھی تھوڑا عرصہ ہوتا ہے کہ میں شہرت کے محل سے واپس آیا ہوں۔ اور اِن لوگوں کو یعنی "ایڈیسن" "سوئیفٹ" "پوپ" "اسٹیل" "کانگرو" اور "کولی سیبر" کو شہرت کے محل میں پہونچا کر آیا ہوں ۔ اور یہ لوگ راستے تمام ایک دوسرے سے برابر لڑتے جھگڑتے گئے ۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ ایک یا دو مرتبہ پوری گاڑی کو بھر کر شہرت کے محل تک پہونچا آتا ہے ۔ بہرنوع تمام کو میں نے بخیریت وہاں تک پہونچا دیا ہے ۔ البتہ راستہ میں "کولی سیبر" نے مسٹر "پوپ" کے کچھ دھپ رسید کئے ۔ اُس کے بعد میں دوسرے سامان کے لئے واپس چلا آیا ۔ یہ سنکر میں نے کوچبان سے کہا کہ دوست اگر ایسا ہی ہے تو مجھے بھی گاڑی میں لے لو ۔ آپ کو ساتھیوں کی ضرورت بھی ہے اور میں اپنے آپ کو بہت مفید ثابت کرونگا ۔ میں سمجھتا ہوں ۔ میری موجودگی سے گاڑی کے چلنے پر کوئی اثر نہ ہوگا ۔ اور یہ میرا خیال ہے کہ شہرت کے محل تک پہونچنا کوئی بڑی بات نہیں ہے ۔

جی ہاں جناب ! آپ صحیح فرماتے ہیں ۔ اُس نے یہ کہا تو ضرور

مگر دروازہ بند ہی رکھا۔ اور مجھ کو سر سے پیر تک گھورنے لگا۔ اس کے بعد کہنے لگا جناب آپ کے ساتھ کوئی لائق قدر "سامان"[1] بھی ہے۔ گو فطرتاً اور چہرے سے آپ مجھے سادہ لوح معلوم ہوتے ہیں لیکن آپ کے ساتھ کچھ سامان نہ ہونے کا افسوس ہے۔ اور یہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ بغیر کچھ گاڑی کا کرایہ ادا کئے میں کسی مسافر کو اس میں گھسنے بھی نہیں دیتا۔ یہ سُن کر میں شرمندہ ہو گیا۔ اور اپنی جیبوں میں کچھ ڈھونڈنا شروع کیا۔ اسی تلاش میں میرا خیال اپنی بغل کی طرف گیا۔ جہاں "بی"[2] کے بہت سے پرچے دبے ہوئے تھے۔ اب میں نے سوچا کہ ان پرچوں کو کوچبان کے سامنے اس طرح سے پھیلا دوں کہ اُن کی چمک دمک سے کوچبان کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ لیکن وہ صرف سرِ ورق اور دیباچہ دیکھ کر کہنے لگا کہ جناب! اس سے بہتر تو کہیں میں نے کبھی اس کا نام بھی نہیں سُنا اور یہ ناممکن ہے کہ میں آپ کی گذشتہ عزت و وقعت سے مرعوب ہو کر آپ کو گاڑی میں آنے دوں محض اس وجہ سے کہ مجھے آپ سے اچھے باوقعت مسافر مل سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی

---

[1] "سامان" سے مراد یہاں کوئی تصنیف یا تالیف ہے۔ [2] "بی" ویلکی ناشر نے گولڈ اسمتھ کو یہ رائے دی تھی کہ "ریمبلر" کے جوڑ پر ایک ہفتہ واری پرچہ نکالنا چاہئے۔ جس کی قیمت تین پنس ہو۔ چنانچہ ۱۷۵۹ء میں یہ پرچہ جاری ہوا اور پورے آٹھ نمبروں تک گولڈ اسمتھ کی ادارت میں نکلتا رہا۔

آپ مجھے ایک بے ضرر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر اتفاق سے کوئی جگہ خالی ہو گی تو میں آپ کو بطور رعایت اور خیرات کے اندر بُلا لونگا۔

یہ سُن کر میں باہر کوچبان کے بازو دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ میں بھی اپنی لیاقت اور قابلیت منوا کر ہی چھوڑونگا اور پھر اندر جگہ حاصل کروں گا۔

میرے بعد ایک "صاحب علم" اور نازل ہوئے۔ جو عجیب وضع کے تھے۔ یہ دور ہی سے اُچھلتے کودتے اور اپنے جسم کے اطراف اپنے ہی نظم کے متعدد پرچوں کو لٹکائے۔ سریلی آواز سے گاتے ہوئے نہایت اطمینان سے دروازہ کھولکر گاڑی کے اندر داخل ہونے لگے۔ ان کی اس برق خرامی پر میری نظر اُن پر ذرا جھجھلتی ہوئی پڑی مگر پھر بھی ہر پرچے کی سُرخی "انسپائر" دور سے واضح تھی۔ انہوں نے گاڑی کا دروازہ خود سے کھولا۔ اور بلا کسی کے بلائے اندر آنا ہی چاہتے تھے کہ کوچبان نے گردن پکڑ کر اُن کو نیچے اُتار لیا۔ اس سلوک ناروا سے صاحب موصوف کو بہت سخت غصہ آیا۔ لیکن کوچبان ہر حالت سے اپنا

"ایک صاحب علم" اِن کا نام "ڈاکٹر جان ہل" تھا اور علم نباتات پر ان کی کئی تصانیف تھیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "انسپکٹر" نامی کتاب میں تھا۔ جو فرداً فرداً لندن کے اخبار "ڈیلی ایڈورٹائیزر" میں شائع ہو چکے تھے۔ ۱۷۵۱ء

اطمینان چاہتا تھا۔ آخر کار اُس نے کہا اجی مہربان! آپ کے ساتھ تو اس قدر سامان ہے کہ گویا آپ مغربی جزائر کی کسی مہم کو سر کرنے جا رہے ہیں، اور اس سامان سے آپ کی جسامت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس قسم کی بیس گاڑیوں کا آپ کچومر نکال دینگے۔ مگر جناب معاف فرمائیے۔ آپ اندر تو نہیں آسکتے۔ اس پر وہ صاحب منت اور خوشامد سے کہنے لگے کہ میاں کوچبان یہ سامان بظاہر آپ کو وزنی معلوم ہو رہا ہے۔ مگر حقیقت میں بہت ہلکا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو کہیں کونے میں۔ میں اپنی جگہ خود نکال لونگا۔ "جیہیو" یعنی کوچبان بڑا ہی مستقل مزاج آدمی تھا۔ اُس نے نہ چھوڑا اور اس ناخواندہ مہمان کو مایوس واپس جانا پڑا۔ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ اُس کے تمام پرچوں کو ہوا میں اُڑا دیا۔ ابھی اس مرحلے سے ہم لوگ مطمئن نہیں ہوے تھے کہ پھر یہی شخص تھوڑی دیر میں اپنے لباس کو ایسا تبدیل کرکے آیا۔ جیسا کہ اکثر ناٹکوں میں اداکار ہوتے ہیں۔ اُس کے کپڑوں میں لیس لگی ہوئی تھی۔ اور ہمراہ کوئی وزنی سامان نہیں تھا مگر ایک "گلدستہ"[1] اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے آتے ہی غصہ سے کوچبان کی ناک میں اس گلدستہ کو ٹھونس دیا۔ اور گاڑی کے دروازہ کا دستہ پکڑ کر اندر جانے لگا۔ میں سمجھا کہ اب لڑائی بڑھی۔ اس لئے کہ کوچبان بھی متمر آدمی تھا اور ایسی بے عزتی ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا چنانچہ

---

[1] "گلدستہ" یہ ایک نباتیات کا رسالہ تھا۔

اُس نے میری مدد سے اُس کو وہاں سے نکال دیا۔ لیکن پھر وہی شخص یونانی ہیرو "پروٹیس"[1] کی طرح گاتے ناچتے اور گلدستہ سونگھتے ہوئے چپکے سے رفوچکر ہوگیا۔ "ڈاکٹر جان ہل" کے بعد جو اُمیدوار[2] آیا اُس کو خود جگہ کے ملنے کا یقین نہ تھا۔ تاہم وہ کوشش ضرور کر رہا تھا۔ مگر اُس کی کوشش بھی عجیب دلچسپ تھی۔ وہ بالکل ناٹک کا اداکار معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہی وہ کوچبان کے سامنے آیا۔ وہ نیم قد ہوکر ایک سلام بجا لایا۔ جس کا جواب کوچبان نے بھی جھک کر ہی دیا۔ پھر کوچبان نے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا اور کس قدر سامان ہے۔ اُمیدوار نے کہا۔ جی یہی معمولی ہے۔ اور یہ کہکر اُس نے کچھ ڈراموں کے چند ایکٹ چند مضامین مختلف موضوع پر۔ اور ایک مکمل حزنیہ ڈرامہ دکھلایا۔ کوچبان نے اس سامان کو غائر نظر سے دیکھا اور کہا کہ فی الوقت اُس کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ اس کی وجہ سے گاڑی میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ ہاں کوچبان نے کہا کہ میں نے قانون فطرت کی کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ ان چیزوں کے لئے بھی ایک وقت آئیگا۔ جبکہ عوام کو ان چیزوں کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اور دوسرے یہ کہ محض ان چیزوں کی بنا پر اتنک

---

[1] "پروٹیس" یہ ایک بڈھا طاقتور یونانی ہیرو تھا۔ جس کو اپنی شکلوں کے بدلنے میں کمال تھا۔
[2] "اُمیدوار" یہ آرتھر مرفی ایک ڈرامہ نویس تھا۔ جس کا ڈرامہ "چین کا یتیم" بہت مشہور ہوا تھا یہ وہی شخص ہے۔ جس نے ڈاکٹر جانسن کو تھریلس سے ملایا تھا۔

تو کوئی شہرت کے محل تک نہیں پہونچا ہے۔ اس مرتبہ شاعر نے تنک مزاجی سے پوچھا۔ کیا کہا آپ نے؟ کیوں کیا میری حزنیہ ناٹک جس میں میں نے سچائی اور آزادی پر کافی بحث کی ہے کافی نہیں ہے۔ کوچبان نے ڈانٹ کر کہا۔ اجی جناب ذرا مناظر فطرت کی طرف نظر کیجیئے۔ صرف یہی نہیں کہ اچھی اچھی دلخوش سرخیوں کی بدولت آپ شہرت کے محل تک پہونچ سکیں۔ کیا مسئلہ آزادی پر آپ نے پہلی مرتبہ قلم فرسائی کی ہے۔ یا بلا کسی غرض و غایت کے آپ سچائی کے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کو کسی وقت جگہ مل جائے۔ لیکن جناب اس وقت تو میں معافی چاہتا ہوں۔ اچھا ہٹیے۔ آپ بازو ہو جائیے۔ ایک صاحب اور آرہے ہیں۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دور سے ایک بہت "بھاری بھرکم"* آدمی گاڑی کی طرف آتا ہوا نظر آیا جس کی صورت سے دور ہی سے متانت اور وقار ٹپک رہا تھا۔ لیکن اس شخص کے عادات و اطوار غیر مانوس تھے۔ اس شخص کو پہلے پہل دیکھ کر میرے دل میں اس کی طرف سے کچھ اچھا خیال پیدا نہیں ہوا۔ مگر باوجود اپنی بدمزاجی کے وہ صاف دل اور بے غرض ضرور معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اطمینان سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اور کچھ اُلجھے ہوئے کاغذات کے بلندے کو نشست کے نیچے رکھ دیا۔ کوچبان سے کہاں صبر ہو سکتا تھا۔ اُس نے کہا چلیئے جناب

---

* "بھاری بھرکم" یہ مشہور لغت نویس ڈاکٹر جانسن تھا۔

چلئے۔ باہر نکلیے۔ مسافر بھی غصہ سے بپھر کر کہنے لگا۔ کیوں کیا میری لغت کافی
ہیں ہے۔ کوچبان نے کہا جناب تو اس درست کیجئے۔ تقریباً دو ہزار سال
ے میں اس گاڑی کو ہانک رہا ہوں۔ جس میں بچے بوڑھے جوان سب ہی
بیٹھتے ہیں۔ لیکن میری اتنی عمر اگئی اور کبھی میں نے کسی لغت کے مؤلف
و کہیں نہیں دیکھا۔ اور نہ کسی کو پہونچا کر آیا ہوں۔ لیکن مہربان معاف
لیجئے وہ دیکھیے ایک چھوٹی سی کتاب آپ کی جیب سے اُبھر نکلی آرہی ہے
س کا کیا نام ہے۔ مصنف نے کہا اجی چھوڑو۔ اُس کو پوچھکر کیا کیجئے گا وہ
ایک معمولی حقیر سی تالیف ہے۔ جس کو "ریمبلر"[1] کہتے ہیں "ریمبلر" اچھا۔
یمبلر" جناب آپ معاف کیجئے آپ شوق سے گاڑی میں بیٹھ سکتے ہیں میں نے
اپالو" (سورج کے دیوتا) کے دربار میں اس کی تعریف سنی ہے اور "کلیو" جو ایک
ورخ تھا وہ "ایڈیسن" کے رسالے "اسپکٹیٹر" سے زیادہ اس کو پسند کرتا تھا۔
رعوام بھی اس کو سلاست زبان برجستگی فقرات۔ باموقع محاورات کی وجہ
ے بہت پسند کرتے تھے۔ ابھی یہ سنجیدہ ہستی ٹھیک طور پر جمنے بھی نہ پائی تھی
"ایک صاحب"[2] اور آتے ہوئے نظر آئے۔ جو سرتاپا موجودہ فیشن میں

---

[1] "ریمبلر" یہ جانسن کا مشہور و معروف رسالہ تھا جو کہ ہر شنبہ و سہ شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ یہ ۱۷۵۰ء
سے ۱۷۵۲ء تک جاری رہا۔ [2] "ایک صاحب" یہ ڈیوڈ ہیوم ایک مضمون نگار تھا جو
اپنے فلسفیانہ مضامین کی وجہ سے بہت مشہور ہو گیا تھا۔ تاریخ انگلستان کو بھی اس نے
مرتب کیا تھا ۱۷۱۱ء تا ۱۷۷۶ء۔

غرقاب تھے۔ پہلے تو انہوں نے گاڑی میں خود سے بیٹھنے کی جرأت کی۔ مگر بعد ٹھٹھک کر کوچبان سے اندر آنے کی اجازت چاہتے لگے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا بنڈل تھا۔ کوچبان نے کہا میں آپ کے مضامین کا نمونہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ذرا انشائیے۔ مصنف نے کہا مسٹر کوئی خاص بات نہیں ہے۔ البتہ آج کل جس قسم کا مذہب اپنے ملک میں رائج ہے اُس پر زبردست تنقید کی گئی ہے۔ کوچبان نے بگڑ کر کہا۔ تب تو جناب آپ کو گاڑی میں جگہ نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ آپ نے صرف تصویر کے ایک رُخ کی رنگ آمیزی کی ہے۔ مصنّف نے استعجاب سے کہا۔ ہائیں کیا کہا آپ نے۔ یہ محض آپکا خیال ہے۔ آپ اگر مجھے اجازت دیں تو ابھی چند منٹوں میں۔ میں آپ کو قایل کئے دیتا ہوں۔ پھر آپ کے دل میں شکوک باقی نہیں رہینگے۔ کوچبان نے سر ہلاتے کہا۔ مہربان چاہے آپ جو کچھ کہیں۔ مگر جو شخص مذہب پر اعتراض کرتا ہے۔ میں اُس کو کُندہ ناتراش اور پکّا بے وقوف سمجھتا ہوں۔ اور آپ گاڑی میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ اس پر مصنّف نے کہا۔ جناب اگر آپ بحیثیت مضمون نگار مجھے اندر نہیں آنے دے رہے ہیں۔ تو بحیثیت مورخ تو جگہ دیجئے۔ جس کو تمام نے پسند کیا ہے اور اُس کی بہت کچھ تعریف ہو چکی ہے۔ کوچبان نے کہا ہاں یہ آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر میں نے صرف ایک جلد کی تعریف سُنی ہے۔ اور وہ شاید شہرت کے محل تک بھی پہونچ گئی ہے۔ اگر اس وقت وہ آپ کے پاس ہے تو آپ بلا کسی اور مزید استفسارات کے گاڑی میں آ سکتے ہیں۔

اس کے بعد میری نظر "ایک شخص[1]" پر پڑی جس کو مجمع خود دھکیل دھکیل کر آگے بڑھا رہا تھا۔ اور "گاڑی بڑے امیر و کبیر" کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن پھر تھوڑی دیر بعد وہ اسی "گاڑی شہرت" کی طرف چلا آیا۔ یہ شخص دور ہی سے ایک بہت بڑی ضخیم تاریخ بتلا کر اندر آنا چاہتا تھا۔ کوچبان نے کہا جناب میں آپ کا نام سن چکا ہوں۔ لیکن ایک مورخ کی حیثیت سے نہیں اچھا اس کے علاوہ کیا اور کوئی سامان آپ کے پاس نہیں ہے۔ مورخ نے کہا۔ مہربان سامان وامان کیا میرے پاس ایک عشقیہ قصہ اور ہے۔ جس میں فطرت سے مناسبت رکھنے والی کوئی شے نہیں ہے۔

کوچبان نے کہا اوہ آپ سخت غلطی پر ہیں۔ ایک مکمل عشقیہ اور دلچسپ قصہ لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جس کو اکثر لوگ محض کھیل تصور کرتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح خیال ہے کہ انہی قصوں کی بدولت میں "سروینٹس[2]" اور "ساگریس[3]" دونوں کو جگہ دے چکا ہوں۔ اگر تمہارا دل چاہتا ہے تو تم بھی آجاؤ۔ جب یہ تینوں ادبی ہستیاں اندر بیٹھ گئیں تو میں نے

---

[1] "ایک شخص"۔ یہ ٹوبیس اسمالٹ ایک مورخ اور ناول نویس تھا۔ جس کی ناول "راڈرک رانڈم" بہت مشہور ہوئی تھی ۱۷۲۱ء تا ۱۷۷۱ء

[2] "سروینٹس"۔ ڈان کیوک سات مشہور مزاحیہ ناول کا مصنف۔

[3] "ساگریس"۔ یہ ایک فرانسیسی شاعر تھا اور "بربنیک" نامی ناول سے مشہور ہو گیا تھا۔

کہا چلو دیکھیں یہ لوگ آپس میں کیا گفتگو کرتے ہیں۔ بجائے آپس کی محبت کے یہ لوگ ایک دوسرے کے چہرے سے بیزار تھے۔

اس پر مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں نے کہا سخت افسوس ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال کی روشنی سے تاریک دلوں کو روشن کرنے والے کہلاتے ہیں۔ مگر یہاں خود اُن کے دل میں ایک دوسرے سے انتہائی رشک وحسد بھرا ہوا ہے۔ اور ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کیا انہی لوگوں کو لائق عالم فاضل کہا جاتا ہے۔ جو رسم ورواج کی جکڑ بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور آندھی تقلید کر رہے ہیں۔ ان کو تو چاہئیے تھا کہ سوسائٹی کی بُری عادتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں اور اُن کو صحیح طریق پر چلنے کی نصیحت کریں۔ نیز گرے ہوئے دل ودماغ کو بلند کرنے کی فکر کریں۔

اس اثنا میں میں نے دیکھا کہ کوچبان بالکل غافل اور خصوصاً میری طرف سے بالکل بے تعلق ہو رہا ہے۔ اور مزے سے کوچ بکس پر بیٹھا ہے۔ کئی لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اُن کو اندر لینے کے لئے کوچبان سے کہا۔ مگر اُس نے کہا جناب یہ میری شان کے خلاف ہے کہ ایک بار اُوپر چڑھ کر پھر نیچے اُتروں۔ اُس نے کہا فکر کی کونسی بات ہے۔ دوسرے کیمپ میں پھر میں ان لوگوں کو لے جاؤں گا۔ گاڑی چلی اور رفتار سے چلنے لگی۔ چونکہ میں اندر نہ بیٹھ سکا۔ اس لئے میں نے اپنی جگہ تبدیل کر لی۔ اور پچھلی نشست پہ

آگیا۔ تاکہ راستہ تمام اِن بزرگوں کی باتیں تو سنتا رہوں۔

دوسرا خط

دنیا کے باشندوں کے خطوط

انگریزوں کی شان و شوکت۔ اُنکی آزادی۔ اِن دونوں صفات کے کچھ قصّے۔ اخبارات۔ سنجیدگی اور متانت کی مثالیں۔

"لیون چی الینگی" "فینشی" کی معلومات کے لئے جو کہ "ماسکو" میں رہتا تھا۔ ایک روسی قافلہ کے ذریعہ سے "فم ہوم" کو ایک خط بھیجتا ہے۔ جو کہ سرمونیل اکڈیمی واقع چین کا پریسیڈنٹ تھا۔"

ایسے ہی خاموش پسند ہوتے ہیں۔ جیسے کہ جاپانی۔ لیکن سیام کے انگریز باشندوں کی طرح نہیں جو حد درجہ خوددار اور خودپسند ہوتے ہیں میرے یہاں (انگلستان) آنے کے بعد مجھ میں بھی ایک قسم کا غرور پیدا ہوگیا ہے۔ جو کہ یہاں کے باشندوں کی فطری چیز ہے۔ اُن سے پہلے ملاقات پیدا کرنے کے لئے آپ کو عاجزی اور انکساری اختیار کرنی ہوگی۔ پھر کچھ خوشامد سے کام لینا پڑے گا۔ اُس کے بعد وہ آپ سے دوستی اور آپ کا

احترام کرنے لگینگے۔ قوت برداشت انگریزوں میں غیر معمولی طور پر ہوتی ہے۔ مثلاً وہ نہایت فراخدلی سے۔ بھوک۔ سردی۔ تکان اور ہر قسم کی تکالیف کو بہ طیب خاطر سہہ لینگے۔ لیکن ذلت وہ کبھی برداشت نہیں کرسکتے۔ ایک انگریز ذلت کو موت سے زیادہ سخت سمجھتا ہے۔ اور اُس سے موت سے زیادہ ڈرتا ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذلت کو ناقابل برداشت سمجھ کر اُسی کے کارن خودکشی بھی کر لیتا ہے۔ اور جینے پر موت کو وہ اُس وقت ترجیح دیتا ہے۔ جبکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کی عزت و حرمت خاک میں مل چکی ہے۔

فخر و غرور یہ صرف اُن کی خلقی اور قومی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اُن کی مذہبی روایات کو برقرار رکھنے کی بہترین خصائص خیال کیجاتی ہیں۔ ایک انگریز کو اپنے بادشاہ سے ایسی محبت کرنا سکھایا جاتا ہے جیسا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوست کو چاہتا ہے۔ لیکن قانون کے مقابلہ میں وہ کسی چیز کو اتنی اہمیت نہ دیگا جیسا کہ وہ خود اُس کی عزت کرتا ہے۔ وہ اُن قوموں کو نہایت نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جو کہ خود مختار اور آزاد ہو سکتی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی گردن پر سے غلامی کا جُوا نہیں اُتارتیں۔ ان لوگوں کا ابتدا میں زور و شور ایک ظالم کے خوف و وحشت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں گویا آسمان سے فرشتہ خصلت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

آزادی کی دل خوش کُن صدا اُن کے ہر مجمع اور ہر جماعت سے

آتی ہے۔ اس آواز پر ایک دو نہیں بلکہ ہزار ہا افراد جان دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ اُس میں کا کوئی شخص بھی [illegible] صحیح مفہوم سے واقف بھی نہیں ہوتا۔ ذیلی طبقہ یہ خیال کرتا ہے [illegible] کی آزادی کے پاسباں ہیں۔ اور بسا اوقات وہ ایسی زبان [illegible] کرتے ہیں جس کو کہ چین کا بادشاہ جس کی حکومت آسمان و زمین پر ہے۔ اُس کے مُنہ سے بھی ایسے الفاظ نہیں نکلتے ہوں گے۔

ابھی چند دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن میرا گذر جیل خانہ کے بازو سے ہوا۔ کچھ آپس کی گفتگو کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ اور میں ارادتاً سُننے کے لئے ٹھہر گیا۔ گفتگو ایک مقروض کی تھی جو کہ سلاخوں میں بند تھا۔ پاس ہی ایک مزدور زیادتی بوجھ کی وجہ سے دم لیتا کھڑا تھا۔ اور ایک سپاہی بھی قریب ٹہل رہا تھا۔ آپس کا موضوعِ سُخن یہ تھا کہ فرانسیسیوں کے خطرناک حملوں سے ملک کو کس طرح بچایا جائے۔ قیدی نے کہا اور تو کچھ نہیں دوست مجھے فکر یہ ہے کہ اگر فرانسیسی جنگ میں فتحیاب ہو گئے تو ہم انگریزوں کی آزادی کا کیا حشر ہوگا۔ دوستو آزادی انگریزوں کا خاص حق ہے۔ اسکے تحفظ کے لئے ہم اپنی جان تک قربان کردینگے۔ اس کے قطع نظر فرانسیسی ہرگز ہم لوگوں کو نکالنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ اس غلام قوم سے کبھی فخر و مباہات کی توقع نہیں کی جاتی۔ جو خود برسوں غلام رہ چکی ہو۔ وہ لاکھ ظفریاب ہو جائیں مگر پھر بھی ایسا کرنے کی اُس میں ہمت نہیں ہوسکتی۔

مزدور غصہ سے کہنے لگا۔ نامعقول غلام کہیں کے۔ یہ تو صرف اسی

قابل ہیں کہ بھاری بھرکم بوجھ اٹھایا کریں۔ اگر خدانخواستہ کہیں غلام نہ راج ہو گیا۔ آ... خدایہ شراب کی صراحی جو میرے ہاتھ میں ہے اس میں کی شراب ... ہر ہو جائے۔ مگر نہیں مجھ کو فوراً جانباز وطن کی فہرست میں جلد ا... نام لکھا دینا چاہئے۔

اس کے بعد سپاہی نے شراب کی صراحی کو اپنے ہاتھ میں لے لی اور کہنے لگا یار آزادی کے متعلق ہم کو ایسا خیال نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ ہم سے جس قدر بھی ہو سکے اس کی نگہداشت کرنی چاہئے۔ مگر میرے دوستو مذہب بس اس مذہب پر "شیطان تجھے آگ میں جھونک دے"۔ (یہ اُن لوگوں کی ایک نہایت با وقعت قسم کہلاتی ہے) اور ہم پر یقیناً فرانسیسوں کو حکمراں ہو جانا چاہئے۔ اس لئے کہ ہم لوگ مذہب سے بالکل بے پروائی برتتے ہیں۔ یہ کہکر شراب کو مذہبی رسم کے موافق اُس کے چند قطرے آگ میں ڈالتا بجائے اُس کے اُس نے صراحی منہ سے لگا لی۔ اور اپنے استدلال کو اور زیادہ جوش و خروش سے واضح کرنے لگا۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ یہاں کا ہر شخص اپنے آپ کو ایک زبردست سیاست داں سمجھتا ہے۔ اور تو اور یہاں کا طبقہ صنف نازک بھی قومی مسائل میں حسن و عشق پیار و محبت کی رنگ آمیزی کرکے نئے نئے انداز میں اُن مسائل کو پیش کرتا ہے۔ اور چشم ابرو کے تیز تیز ہتیاروں سے اُن پر فتحیابی حاصل کی جاتی ہے۔ اس سیاست دانی کے عالمگیر جذبات کو یہاں کا اخبار ڈیلی گزٹ بہت زیادہ سراہتا ہے جیسا کہ اکثر اپنے یہاں

چین میں ہوتا ہے۔ ہمارے پاس یہ ہوتا ہے کہ خود بادشاہ چین پبلک کو مختلف مسائل سے آگاہ کرتا ہے۔ اور اُن کو سیدھے راستہ پر گامزن کرتا ہے۔ لیکن یہاں اُس کے برخلاف پبلک خود بادشاہ کو متنبہ کرتی ہے۔ اور ہر چیز آزادی سے سوجھا رہتی ہے۔ اس سے تم اس کا اندازہ مت کرو کہ جو خبر بھی اخبار میں چھپتی ہے وہ بالکل مصدقہ ہوتی ہو۔ یا اُن کے اڈیٹرو کو واقعات حاضرہ پر کافی عبور ہوتا ہو۔ بلکہ زیادہ تر ان اخباروں کے اڈیٹروں کے معلومات چار خانوں کی گپیں اور وہاں کی ہفوات ہوتی ہیں۔ اب یہ خبریں پھیلتی کس طرح ہیں۔ اُس کا راز بھی سُن لیجئے۔

چائے خانوں میں اکثر ہارے ہوئے جواری جمع ہوتے ہیں۔ اور شریر شوخ طبع نوجوانوں سے وہ کچھ گپیں سُن لیتے ہیں۔ اور یہ نوجوان کسی امیر وکبیر کے بٹلر سے کچھ سُن پاتے ہیں۔ اور یہ بٹلر اپنے آقاؤں سے کسی خوش گپی کی محفل میں سنکر سب ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ اور ان تمام کی اصلی جڑ یہ ہوتی ہے کہ وہ دولتمند لوگ کھانے کی میز پر یا سگریٹ نوشی کے کمرے میں اپنی تفریح طبع کی خاطر کسی خبر پر رنگ چڑھا لیتے ہیں اور ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔

عموماً انگریز عزت وعظمت کے بہت زیادہ شائق ہوتے ہیں۔ اور آپس کی عشق ومحبت کی داستان کو سُننا اور اُس سے دلچسپی لینا وہ بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اُن کی اِس قسم کی خوش گپیاں بھی ایک سادہ لوح آدمی کے لئے مُعمّہ سے کم نہیں ہوتیں۔ اور یہ اکثر دیکھا گیا ہے ایک

بے وقوف کی باتیں تمام محفل کے لئے باعث مسرت ہوتی ہیں۔ اور اکثر تم "چینی" بھی ایسی ایسی باتوں پر محظوظ ہوتے ہوگے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ خوشگی دائمی مسرت بخش نہیں ہوتی۔

انگریز جو کچھ چاہتے ہیں ایک مسرت آمیز گفتگو کے خواہاں ہوتے ہیں اور اس قسم کی مسرت بخش خبروں کو وہ سنجیدگی کا جامہ پہنا تا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تم یہ سُن کر مجھ پر ہنسو گے کہ میں خواہ مخواہ انگریزوں کی تعریف کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پیکین میں اکثر انگلش مشن کے لوگوں سے تم سے راہ ورسم ہوگی۔ اور اُن کی گفتگو سنیکا اتفاق ہوا ہوگا۔ حالانکہ اُن لوگوں میں رشتۂ اتحاد خصوصاً تم سے ایک تاجر اور ایک بحری مسافر سے زیادہ نہ ہوتا ہوگا یعنی اُن کے عادات و اطوار بہت کچھ متعجب کرنے والے ہوتے ہونگے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود پھر بھی میں۔ یہ کہونگا کہ انگریزوں کی متانت اُن کی سنجیدگی اُن کی ہمسایہ قوموں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور اس فن میں سب سے بڑا اگر اُن کی کوشش و مشقت ہے۔ وہ بھی اُس صورت میں جبکہ وہ خود دوسروں کی لطف و مہربانی نہیں چاہتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے لوگ ایک اجنبی مسافر سے بھی مہربانی کے خواستگار نظر آتے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہماری استدعا کے مفہوم کو سمجھ لیں۔ مگر برخلاف اس کے جب انگریز کسی سے مہربانی و سلوک کرتے ہیں تو وہ اس طرح سے بے نوجہی اور بے پروائی ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے سلوک کا پتہ کسی اور کو نہ چلے۔

در لوگ بھی سمجھیں کہ وہ سائل سے نفرت کرتے ہیں۔ حالانکہ فی نفسہ
ہ مدد دینے پر تلے ہوتے ہیں۔ ابھی چند ہی دن کا ذکر ہے۔ ایک دن
ں ایک انگریز اور ایک فرانسیسی کے ساتھ شہر کے باہر مفصلات میں
فریح کی غرض سے ان لوگوں کے ہمراہ گیا۔ راستہ میں ہم لوگوں پر
شدید بارش کا حملہ ہوا۔ اتفاق سے میں یہاں کے موسم سے واقف نہ تھا
ور میرے پاس کسی قسم کا کوئی گرم کوٹ بھی نہ تھا۔ لیکن ان دونوں
کے پاس سردی کے بچاؤ کا کافی سامان تھا۔ میرے دونوں دوست
ں باد و باراں کے طوفان سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ اور میں
نجام سے بے خبر تھا۔

جب میرے انگریز دوست نے مجھ کو کانپتے اور میرے دانت سے
انت بجتے ہوئے دیکھا۔ تو وہ کہنے لگا۔ "آہاں" خوب تم کانپ رہے ہو۔ اجی
۔ یہ گرم کوٹ کیوں نہیں پہن لیتے۔ میں نے کہا جناب آپ کی اس مہربانی
ا شکریہ۔ مجھے یہ کوٹ نہیں آئیگا۔ معاف کیجئے۔ لیکن جناب اس کوٹ
کے بغیر مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔

اس کے بعد فرانسیسی اپنی مہربانی کو یوں ظاہر کرنے لگا۔ کہنے لگا
یرے عزیز دوست کیا آپ اس کوٹ کو پہنکر مجھے ممنون ومشکور فرمائینگے۔
آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے مجھے بارش وطوفان کی زد سے کس قدر مدد
ل رہی ہے۔ میں خود اس کو اپنی جان سے جُدا کرنے کا عادی نہیں ہوں
ورنہ دوسروں کو بھی کسی حالت میں دیتا ہوں۔ لیکن آپ جیسے مہربان

اور خوش اخلاق دوست کے لئے میں اپنے جسم کا پوست بھی جُدا کرنے کیلئے تیار ہوں۔ صرف اس لئے کہ اگر وہ اُس کے کام آسکے۔

بس ایسے موقعوں کو دیکھ کر میرے دوست تم ہو۔ میں سمجھتا ہوں تم اپنی عقل سلیم سے کام لوگے اور ان واقعات سے اچھے نتائج اخذ کروگے ایسی کتاب جس میں فطرت کی نیرنگیاں ہوں اور اُن سے کچھ سبق حاصل ہو رہا ہو۔ صحیح معنوں میں وہ معلومات کا گنجینہ کہلائی جاسکتی ہے۔ اس طرح سے وہ شخص عقلمند کہلا سکتا ہے۔ جو سب سے بہتر اور مفید انتخاب ہر شئے میں کرسکے۔ جس سے اس کو فائدہ حاصل ہو۔

—— اچھا خدا حافظ ——

تیسرا خط

ویسٹ مینسٹر ابی کی سیر

"لیون چی انگی" فم ہوم کو ایک خط لکھتا ہے۔ جو کہ سر ہونیل اکیڈمی
واقع چین کا پہلا پریسیڈنٹ تھا"

میں ویسٹ مینسٹر ابی (ویسٹ مینسٹر کا گرجا) کی سیر سے واپس ہوا تھا
آنے کے بعد میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں
بڑے بڑے فلاسفر۔ نوجوان بہادر۔ اور انگلستان کے مشہور و معروف
بادشاہ دفن ہیں۔ اُن کے کتبات دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ دیکھو کیسے
کیسے قابل قدر لوگ کس کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہیں۔ خیال کیجئے
ایک ایسا محل جو بہت پرانا اور بوسیدہ ہو گیا ہو۔ اور اس میں مذہبی عبادات
کی فراوانی کی وجہ سے خود اُس میں قنطویت کا اثر آگیا ہو۔ اور بظاہر
جس کی کھڑکیاں دُھندلی۔ جس کے ستون ٹوٹے ہوئے۔ جس کی چھت
گرد و غبار کی وجہ سے سیاہ ہو گئی ہو۔ یہ امر لائق غور ہے کہ ایسے مقام
کو دیکھ کر ایک سیاح پر کس قسم کا اثر ہو گا۔ میں نے بیچ گرجا میں کھڑے
رہکر اپنے اطراف نظر ڈالنی شروع کی۔ ہر دیوار کے قریب ایک
مجسمہ نصب تھا۔ بعض جگہ پر کتبات اور متعدد مقامات پر تاریخ
وفات کندہ تھیں۔

یہ دیکھ کر میں نے کہا۔ اے کاش! یہ انسان۔ یہ فانی انسان یہ گرد و غبار کا ذلیل انسان جو اس وقت مٹی میں مل چکا ہے۔ اپنی کس قدر لاچاری۔ بے بضاعتی۔ اور عاجزی کو ظاہر کر رہا ہے۔ اس وقت گو میں خود اپنی عاجزی کا اعتراف کر رہا ہوں۔ لیکن یہاں پہ جتنے اس وقت عقلمند۔ بہادر۔ فلاسفر۔ جمع ہیں سب سے اچھے نتیجے میں اخذ کر سکتا ہوں۔ ان لوگوں نے جو یہاں آرام کر رہے ہیں اپنے نام کو برقرار رکھنے کے لئے کس قدر محنت و مشقت نہ کی ہوگی۔ اور آخر نتیجہ یہی ہوا کہ اُن کو بھی قبر کا کونہ آباد کرنا پڑا۔ جہاں اُن کی خدمت کرنے کے لئے کوئی خدمت گار نہیں ہے۔ ہاں ہیں تو صرف قبر کے کیڑے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں اُن کی خوشامد کرنے کے لئے کوئی ہوا خواہ نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو صرف اُن کی لحد کا کتبہ۔ جو اُن کی مدح سرائی کر رہا ہے۔ اور اُن کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

میں اس ناپائیداری کے خیالات میں بالکل مستغرق تھا کہ ایک معزز آدمی جو سرتاپا سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ میرے پیچھے پیچھے وہ بھی چلنے لگا۔ وہ میرے لئے اور میں اُس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ میری باتوں میں خواہ مخواہ مخل ہونے لگا۔ اور کہنے لگا جناب اگر آپ مناسب تصور فرمائیں تو میں یہاں کی آپ کو مکمل سیر کراؤں۔ اور ہر شئے پر اپنے معلومات کا کافی اظہار کروں گا۔ اگر کسی کتبہ

کی تحریر جو آپ کے لئے وقت طلب ہو گی۔ میں اس کو سہل ترین بنا کر آپ کے سامنے پیش کرونگا۔ نیز آپ کے تعجبات کو حقائق سے بدل ڈالوں گا۔ میں نے اُن کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ اور میں نے کہا کہ میں یہاں انگریزوں کی متانت اُن کی سیاست دانی اُن کی عقلمندی۔ اور اُن کے انصاف کو دیکھنے آیا ہوں۔ کہ مرنے والے پر وہ جو اس قدر مہربانی اور اُن کی توقیر کرتے ہیں آیا وہ حق بجانب ہوتی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا اگر یہ چیزیں نمائشی اور تصنعات سے ہیں تو اُس کو مناسب طریقے پر ظاہر کر دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ لوگ جن کی خوشامد کی جا رہی ہے وہ سمجھیں اور بجائے فکر و اندیشہ کے اُن کو فرحت حاصل ہو۔ اور وہ لوگ جو در اصل اس کے اہل ہیں اُن کے لئے یہ چیز سرچشمہ مسرت ثابت ہو گی اور وہ اس سے محظوظ ہوں گے۔

ہر فرض شناس حکومت کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ۔ یہاں جس قسم کے کتبات لگے ہیں اور جن کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ ملک کے ہر نونہال کو اس قسم کی جائز تعریف و توقیر کا مستحق بنایا جائے۔ اور ہر فرد میں اس قسم کی اہلیت پیدا کی جائے۔ اور ہر طرف ان لوگوں کی تعریف پھیلے۔ اگر مجموعی حیثیت سے دو چار لائق آدمی ملک میں پیدا بھی ہو جائیں تو یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں ہو گی۔ کوشش تو اکثریت کی ہونی چاہیئے۔ یہ بھی واضح ہے کہ جو شخص اس لائق ہو گا کہ دنیا اُس کی تعریف کرے۔ وہ یقینی یہیں دفن ہو گا۔ یہاں پر ایسے اخلاقی مظاہرہ

کے علاوہ انسان کو اپنی اصلیت اور حقیقی جذبات کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہاں کوئی معمولی شخص دفن نہیں ہو سکتا۔ جبتک اُس میں کوئی خاص بات اور کوئی غیر معمولی قابلیت نہ ہو۔ مرد سیاہ پوش دمیان اِن بلاک Man in Black) کو میں نے دیکھا کہ وہ میرے فلسفیانہ سوالات اور تقصوفانہ گفتگو سے پریشان ہوا جا رہا ہے۔ اور مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں ہے۔ تب میں نے اپنے سوالات کی بارش اُس پر بند کر دی۔ اور ہم دونوں آہستہ آہستہ ہر کونہ کی طرف دیکھنے کے لئے آگے بڑھے۔ تاکہ ہر کتبے کے مکتوب الیہ کے حالات معلوم کریں۔

میری نظر فطرتاً ایک نہایت خوبصورت کتبے پر پڑی۔ اُس جیسا وہاں گرجے بھر میں نہ تھا۔ میں دریافت حالات کے لئے اُس کے قریب ٹھیر گیا۔ اس پر میرے رہبر (گائیڈ) نے کہا حضور پہلے میں آپ کو بادشاہوں کے کونے میں لے چلتا ہوں۔ جہاں بڑے بڑے عظیم الشان والی سلطنت محو خواب ہیں۔ اُس کتبہ پر نہایت خوبصورت بیل بوٹے اور نہایت اچھا نقش و نگار بنا ہوا تھا۔ پس یہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی بادشاہ کی خدمت میں ایک حقیر تحفہ نصب کیا گیا ہے۔ جس نے اپنے ڈوبتے ہوئے ملک کو دشمنوں کے بے پناہ حملوں سے چھٹکارا دلایا ہو۔ یا یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کسی جانباز وطن کا مزار ہے۔ جس نے اپنی محکوم قوم کو غلامی کے پنجے سے نجات دلائی ہو۔ میرا رہبر میرے ان خیالات پر مسکرانے لگا۔ اور کہنے لگا نہیں صاحب

یہ بات نہیں ہے۔ جو شخص اس قدر زبردست خدمت کرے گا۔ کیا اُس کا کتبہ اس قسم کا ہوگا۔ وہ بے مثال کتبہ تو عجوبہ روزگار ہوگا۔ مگر جناب خصوصاً عوام کی خدمت کے لئے اور اُن کے قلوب میں جگہ حاصل کرنے کے لئے بڑی عاجزی نفس کُشی اور انکساری کی ضرورت ہے۔ یہ سُن کر میں نے کہا کیوں دوست تین چار جنگیں فتح کر لینا دس پندرہ گاؤں پر قبضہ جما لینا کیا یہ قابل تشفی خوبیاں نہیں کہلائی جاسکتیں۔ یہ سُنکر "مرد سیاہ پوش" نے کہا کہ آپکا کہنا بجا ہے۔ کہ دس پندرہ قصبات پر قبضہ جما لیا جائے۔ یا متعدد جنگوں میں شریک رہکر اُن کو فتح کر لیا جائے۔ یہ یقینی خدمت ضرور ہیں۔ مگر اس کو سُن کر آپ بہت متعجب ہوں گے کہ ایک کتبہ یہاں ایسا بھی شاندار لگا ہے۔ جس کے مالک نے نہ تو جنگیں فتح کیں ہیں اور نہ کسی مقبوضات پر قبضہ جمایا ہے۔ جو جنگ میں حصہ لینا یا مقبوضات پر قبضہ کرنا تو درکنار اُس نے کبھی جنگ دیکھی بھی نہیں ہے۔ تب میں نے کہا شاید ایسا کتبہ کسی شاعر شیریں مقال کا ہوگا۔ جس نے اس قدر لافانی شہرت حاصل کی ہو۔ میرے رہبر نے کہا۔ نہیں جناب یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ وہ شخص جو یہاں مدفون ہے۔ شاعر ہونا تو بڑی چیز ہے۔ اُسے الفاظ بھی موزوں کرنے نہیں آتے۔ خوش طبعی اور مذاق و دل لگی۔ میں وہ دوسروں پر حسد کرتا ہے۔ اس لئے کہ اُس میں یہ چیزیں موجود نہیں ہیں۔ اس پر میں نے اپنی لاعلمی اور بے وقوفی کا اظہار کرتے ہوئے کہا جناب آپ ہی تبلائیے وہ کون ہے اور اس کا کیا نام و نشان ہے۔ اور اُس نے ایسی شہرت

کیسے حاصل کرلی۔ اور وہ کیسے ممتاز ہوگیا؟

ممتاز۔ بے شک ممتاز۔ جناب وہ تو ایسا ممتاز ہوگیا کہ اس گرجا میں اس کو جگہ دیدی گئی۔ وہ بھی کسی غیر معروف گرجے میں نہیں بلکہ دنیا کا عظیم الشان گرجا "ویسٹ منسٹر ابی" میں۔ پھر میں نے پوچھا واللہ بڑے حیرت کا مقام ہے۔ قسم ہے اپنے آبا و اجداد کی کہ وہ یہاں آ کیسے گیا۔ کہیں اس نے ایسا تو نہیں کیا کہ متولی گرجا کو خوب رشوت چکھادی ہو اور اس عیاری سے جگہ حاصل کرلی۔ اگر بالفرض اس نے ایسا کیا بھی ہے تو کیا اس کو ایسے ذی وقعت صاحب علم۔ اور علمائ و فصحا کی صحبت میں رہتے ہوئے۔ شرم نہیں آتی۔ جبکہ وہ خود نرا گاؤدی ہے۔

دوسرے یہ کہ معمولی قابلیت کی شہرت یہاں شہرت ہی نہیں کہلاتی۔ "مرد سیاہ پوش" نے کہا جناب میرا تو یہ خیال ہے کہ وہ شخص دولت مند ضرور ہوگا۔ اس کے مصاحبین اور اس کے دوست احباب اس کی دولت کے صبح و شام قصیدے پڑھتے ہونگے جس سے وہ بھی بہت زیادہ اپنے آپ کو رئیس اعظم خیال کرتا ہوگا۔ وہ ان لوگوں کے کہنے میں آگیا۔ اور متولی گرجا پر بھی یہ اثر پڑا کہ وہ بے شک دولتمند شخص ہے۔ اور ایسا سمجھنا خصوصاً متولیوں کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔ جبکہ وہ لوگ خود اپنے نفس کو اپنے پاکباز اور تقدس مآب ہونے کا دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔ بس یہی دولت مند شخص نے ان ملازمین گرجا کو اچھی خاصی رقم دی کہ اس کے لئے ایک خوبصورت اور قابل تعریف

کتبہ تیار کر دے۔ اور اب جو آپ نقش و نگار سے مزین شاندار کتبہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہی کتبہ ہے۔

بہر کیف صرف یہی ایک ایسا شخص نہیں ہے۔ جس کو یہاں دفن ہونے کی تمنا ہو۔ بلکہ بعض ایسے یہاں مدفون ہیں۔ جو زندگی میں ذلت اور نفرت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اور اب وہی لوگ بڑے بڑے لائق عالم فاضل اور قابل ستایش لوگوں کی ہم نشینی کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ چلتے چلتے جب ہم گرجا کے ایک خاص حصہ میں پہونچے تو میرے رہبر نے ایک کونہ کی طرف اشارا کیا۔ اور کہنے لگا وہ دیکھیے وہ شعرا کا کونہ ہے۔ جہاں آپ کو شکسپیر، ملٹن۔ پوپیر۔ اور ڈرائیڈن کے کتبات نظر آئینگے۔ ڈرائیڈن۔ میں نے کہا اس سے قبل تو کبھی میں نے یہ نام بھی نہیں سُنا۔ ہاں البتہ پوپ کا نام میں نے سُنا ہے۔ اچھا تو کیا وہ یہاں موجود ہے۔ اس پر میرے رہبر نے مُنہ بنا کر کہا اجی جناب اُس کو مر کر تقریباً سو سال ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی لوگ اُسکو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے سے بعض نہیں آتے ہیں۔ جس نے اپنی تمام زندگی اصلاح خلق۔ فلاح خلق اور ہمدردی بنی نوع میں گزار دی ہو۔ رہبر نے کہا جی ہاں جناب صرف اسی وجہ سے لوگ اُس سے متنفر ہیں۔ یہاں ایک گروہ تنقید نگاروں کا ہے۔ وہ لوگ صرف پبلک کا مذاق دیکھتے رہتے ہیں۔ اور پھر تعریف سے بھرے ہوئے پرچوں پر پرچے شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ڈنس اور اسکریبلر کے مماثل ہوتے

یں۔ جو بمصداق اس کے خفتگان خاک کی تذلیل کی جائے۔ اور موجود
ہستیوں پر نکتہ چینیاں اعتراضات اور اُن کی عزت ریزی کیجائے۔
ایک لایق قابل شخص کی لیاقت کو نہ ماننا اور یہ کہنا ہاں یونہی
جُزی قابلیت کا مالک ہے۔ اور میں ایسے نرے بیوقوفوں کی تعریف
کرنا جو بالکل سادہ لوح ہوں۔ اور ایک ایسے انسان کی ہتک کرنا جو
مُجسم ستودہ صفات ہو۔ اور وہ بھی اس قابلیت کا کہ اُس کی تحریروں کو
رد بھی نہیں کر سکتے۔ یہ وطیرہ ان لوگوں کا ہوتا ہے۔ اور اس قسم کا جتنا
لٹریچر ہوتا ہے۔ سستے داموں ایک لالچی کتب فروش کے ہاتھ بیچ دیا جاتا
ہے جس کی غرض و غایت صرف جلب زر ہوتی ہے۔ بسا اوقات اسی
قسم کے کتب فروش خود ایسے کام انجام دے لیتے ہیں۔ جو اُن کی لیاقت
سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر شاعر اور اہل قلم کے
کچھ نہ کچھ دشمن ضرور ہوتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ حاسد اُن کی مذمت
کر رہے۔ اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ کس طرح سے بھی اُن کو ذہنی تکالیف
میں مبتلا کر دیا جائے۔ اور صرف اپنی جھوٹی شہرت کی خاطر ان لوگوں
کو غمگین اور خبط الحواس بنا دیتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کیا ہر شاعر
کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ رہبر نے زور سے کہا جی ہاں ہر متنفس کے ساتھ
بھی ہوتا ہے۔ ہاں اگر وہ خوش قسمتی سے جہنی امیر ہو تو شاید اُس کو ایسا
پیش نہ آئے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی دولت کے زور سے ان
تنقید نگاروں کا مُنہ بند کر سکتا ہے۔ اور اپنے لیے انہی لوگوں سے

شہرت کا معاملہ کر سکتا ہے۔ بلکہ خرید لے سکتا ہے۔ اور متولی گرجا کو رقم دیکر
اپنے لیئے شاندار کتبہ بھی خرید سکتا ہے۔ اور یہاں نصب بھی کرا سکتا ہے۔
سنتے سنتے مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا کیا یہاں اعلیٰ مذاق اور ستھری
طبیعت کے لوگ نہیں ہیں۔ جیسے کہ ہمارے یہاں چین میں ہوتے ہیں
جو اپنی اعلیٰ مذاقی اور بلند خیالی کا ثبوت قابل لوگوں کی سرپرستی سے
دیتے ہیں۔ اور نالائق اور مہمل نگاروں کو بدنظری سے دیکھتے ہیں۔
سیاہ پوش نے کہا۔ عالی جناب میں قسم کھاتا ہوں۔ یہاں سرپرست ایک
دو نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ لیکن جناب افسوس اس بات کا ہے کہ یہ تنقید نگار
بری طرح سے ان لوگوں کو چمٹے ہوئے ہیں۔ اور اپنے آپ کو بہترین مصنف
باور کراتے ہیں۔ ایسی حالت میں سرپرست پریشان ہو جاتا ہے اور وہ اصلی
اور نقلی مصنفین میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی شعرا بیچارے دور دور
ٹھکرائے جاتے ہیں۔ اور اُن کے دشمن اُن کے حقوق کو پامال کر کے
بڑے آدمیوں کے دستر خوان پر پلاؤ اور قلیہ اُڑا رہے ہیں۔
گرجا کے اس حصہ کو دیکھ کر ہم لوہے کے دروازے کی طرف مڑے
جس پر رہبر نے کہا ابھی ہم کو بادشاہوں کے کتبات اور مزارات دیکھنے
ہیں۔ بلا کسی اور مزید گفتگو کے میں اپنے رہبر کے ساتھ چلنے لگا۔ اُن
بادشاہوں کے احاطہ میں داخل ہو رہا تھا کہ ایک شخص نے مجھ کو دروازے
پر روک دیا۔ اور کہنے لگا بلا ٹکس ادا کئے کے آپ اندر نہیں آسکتے۔ اس
ٹکس کی طلب پر مجھے تعجب ہوا۔ اور میں نے اُس آدمی سے دریافت

کیا کہ کیا انگلستان کے لوگ ایسی نمائش بھی قائم کرتے ہیں۔ کیا ایسی ذلیل اور حقیر رقم مانگنے سے اُن کی قومی ذلت نہیں ہوتی۔ اور اگر یونہی مفت نمائش رکھی جائے تو اس سے اُن ملک کی شان وشوکت اور آثار قدیمہ کی تعریف نہ ہوگی بلکہ اس قسم کے کیمینے اور ذلیل ٹکس کے عاید کرتے سے اُن کی عزت پر حرف نہیں آتا۔ اس پر دربان نے کہا حضور آپ کے سوالات اور اعتراضات بالکل سچا ہیں۔ کیونکہ میں آپ کی تقریر کو سمجھ نہ سکا۔ اب رہا مطلوبہ تین پنس کا۔ جواب اس کو جناب میں نے خود ایک شخص سے رقم دیکر اُس سے ٹھیکہ حاصل کیا ہے۔ اور اُس شخص نے ایک اور سے کرایہ پر لیا ہے۔ اور اس تیسرے شخص نے ایک اور شخص سے رقم خرچ کرکے ایک اور شخص سے حاصل کی ہے۔ اور بالآخر یہ تیسرا شخص باضابطہ اسٹامپ کے کاغذ پر گرجا کے ملازمین اور متولی سے گتہ پر لیا ہے۔ اس طرح سے ہم سب ایک دوسرے کے سہارے پر جی رہے ہیں۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ باوجود ٹکس ادا کرنے کے بھی اگر یہاں کوئی خاص چیز نظر نہ آئے۔ تب تو بہت کوفت ہوگی۔ لیکن یہاں کے نوادرات کو دیکھ کر مجھے افسوس ہوا اور خواہ مخواہ میری طبیعت منغص ہوگئی۔

وہاں کوئی خاص شئے نہیں تھی۔ ہاں البتہ چند سیاہ کفن۔ زنگ خوردہ اسلحہ۔ کچھ موہوم سے نشانات اور چند پُرانی لاشیں موم سے لپی ہوئی رکھی تھیں۔ مجھے اُس کا ٹکس ادا کرکے بہت افسوس ہوا۔ لیکن اس سے بھی اطمینان ہوگیا کہ دوبارہ پھر مجھے کچھ دینا نہیں ہے۔ اس انتشار

میں ۔ میری نظر ایک شخص پر پڑی جو میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اور بلا کسی
شرم و غیرت کے خوب خوب جھوٹ تراش سکتا تھا۔ اُسی نے کہا کہ
افسوس ایک نوجوان لڑکی کی اُنگلی چھد جانیکی وجہ سے اُس کی موت
واقع ہوئی ۔ ایک بادشاہ کے متعلق کہا کہ اُس کا سر سونے کا تھا۔ اسی
قبیل کی اور بہت سی مہملات بکتا رہا۔ پھر اُسی نے کہا اے معزز مہمانوں
یہ دیکھو یہ شاہ بلوط کی کرسی جو آپ لوگوں کے سامنے رکھی ہوئی ہے۔
اِس کے متعلق بھی ایک عجیب و غریب قصہ مشہور ہے۔ یہ وہی کرسی ہے۔
جس پر تمام انگلستان کے بادشاہ بیٹھ کر تاج حکومت پہنے ہیں۔ وہیں
پر اُس کے قریب ہی ایک پتھر رکھا ہوا تھا جو۔ جو جیکب کا تکیہ کہلاتا تھا
مگر میرے نزدیک نہ تو کوئی خاص بات اُس کرسی میں تھی اور نہ اُس
پتھر میں۔ ہاں قابل قدر اُس وقت ہو گا جبکہ جیکب نے اپنا سر اُس پر
رکھا ہو۔ اور کرسی اس وقت لائق عزت ہو گی۔ جبکہ بادشاہ بیٹھتے
ہوں۔ اُس وقت کے مناظر ممکن ہے کہ قابل اثر ہوں۔ لیکن اِس
وقت تو معاملہ برعکس ہے اور کوئی دلچسپ چیز دیکھنے کہ قابل نہیں
ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ ایک گلی سے میں ایک پتھر اُٹھالوں اور
یہ کہوں کہ جب بادشاہ کا جلوس ادھر سے گزر رہا تھا تو اُس کا پیر
اُس پر پڑ چکا ہے۔ کیا اس میں بھی کوئی چیز لایق استعجاب ہو گی ہمارا
رہبر متعدد تنگ و تاریک راستوں سے لے کر ہم کو گذرا۔ وہ اپنے
آپ میں بڑ بڑا رہا تھا۔ اور جھوٹ کی تو اُس کے پاس بھر مار تھی۔ اُسکے

پاس ایک لکڑی تھی جس کو وہ ادھر اُدھر گھماتا جاتا تھا۔ اس وقت مجھ کو وہ صحرائے گوبھی کے جادوگر کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ ہم لوگ بالکل تھک گئے تھے۔ اور مختلف چیزوں کو دیکھ دیکھ کر ہماری طبیعت بھی اُکتا گئی تھی۔ آخر میں وہ کہنے لگا کہ ذرا اِن جنگی زرہ بکتر اور ان ہتھیاروں کو دیکھئے۔ حالانکہ اُن میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن جناب یہ اسلحہ جنرل مانک کے ہیں۔ اور یہ تعجب کی چیز ہے کہ جنرل جنگی لباس میں رہتا تھا۔ اور حضور اس خود کو دیکھئے یہ ٹوپی جنرل مانک کی ہے۔ تب میں نے حیرت سے کہا واقعی یہ نئی چیز ہے۔ دیکھو تو جنرل ٹوپی بھی پہنتا تھا۔ میں نے اپنے اس نووارد رہبر سے پوچھا کہ اس ٹوپی کی کیا قیمت ہوگی۔ اس کی جناب۔ لیکن اس ٹوپی کی قیمت مجھے معلوم نہیں۔ براہ کرم معاف کیجئے۔ مگر ہاں اتنی عرض ضرور ہے کہ یہ ٹوپی میری اُجرت کی آخری چیز ہے۔ اس کو دیکھنے کے بعد مجھے توقع ہے کہ آپ میری تکلیف کا خیال کر کے جو عنایت فرمائینگے میں اس کو خوشی سے قبول کر لوں گا۔ تب تو میں نے کہا ٹوپی پر آخری قیمت یہ تو بڑا سستا سودا ہوا۔

رہبر نے کہا حضور کیا میں آپ سے جھگڑا کر رہا ہوں۔ جو کچھ آپ کے من میں آئے دے دیجئے۔ آخر سب ہی لوگ دیتے ہیں اور آپ سے بھی میں یہی توقع کرتا ہوں۔ اس پر میں نے کہا مسٹر پھر تو میں آپ کو کچھ نہیں دینے کا۔ اس لئے کہ متولی گرجا کو

چاہیئے۔ کہ وہ آپ کو دیتے رہیں اور لوگوں پر اس کا بار نہ ڈالیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جب ہم اندر داخل ہوتے ہیں تو ٹکس ادا کرکے آتے ہیں۔ اور جب جانے لگیں تو ہم کو چاہیئے کہ کچھ نہ دیں۔ اُس نے کہا آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن متولی گرجا ہمارا کچھ خیال نہیں کرتے۔ اور ہم کو کچھ نہیں دیتے۔ یہ سُن کر میں نے کہا براہ مہربانی آپ مجھے باہر کا دروازہ بتلا دیں۔ تاکہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ ورنہ انہی خدائی فقیروں میں گھرا رہوں گا۔ گرجا سے نکل کر میں نے سیدھا مکان کا رُخ کیا اور تمام راستہ سوچتا گیا کہ آج کے دن میں نے کیا کیا نئی نئی چیزیں دیکھیں۔ اور کون کون سی قابل نفرت چیزوں سے سابقہ پڑا۔

چوتھا خط

چینی ناٹک دیکھنے جاتے ہیں

انگریز۔ تماشہ دیکھنے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ جیسا کہ چینی اداکاری پر جان دیتے ہیں لیکن اُن کے عادات اور طرز میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ اور اُن کو کس طرح سے سنبھالا جائے۔ یہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم چینی ہمیشہ اپنے ڈراموں کو کھُلی فضا میں اسٹیج کرتے ہیں۔ مگر انگریز ہمیشہ بند مکانوں میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم چینی ڈراموں کو دن کی روشنی میں کھیلتے۔ اور انگریز رات میں شعلوں کی روشنی میں ادا کرتے ہیں۔ ہمارے اکثر تماشے ایک دو دن نہیں بلکہ ہفتہ ہفتہ بھر تسلسل کامیابی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں لیکن انگریزوں کے تماشے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے تک تمثیل ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی چند راتوں کا ذکر ہے کہ میرا دوست "مرد سیاہ پوش" جس کی دوستی کا میں نے ٹھیکہ لیا ہے۔ مجھے اپنے ہمراہ ایک تماشہ گاہ میں لے گیا۔ ہم دونوں نے جگہ بالکل اسٹیج کے ایک قدم نیچے حاصل کی۔ چونکہ ابھی پردے کے اُٹھنے میں دیر تھی لہذا میں نے مناسب خیال کیا کہ پیچھے مُڑ کر اور دوسرے ناظرین کے عادات واخلاق اور اُن کے چال چلن کا اندازہ لگاؤں۔ اور ایک نئی چیز دیکھنے سے اُن پر کس قسم کا اثر ہوتا

ہے۔ اس کا بھی اندازہ لگاؤں۔ دولتمند اور امیر لوگ نشستوں کے سب سے نچلے حصے میں بیٹھتے ہیں جس کو کہ "پٹ" کہا جاتا ہے۔ اور غریب تماشائی اپنی غربت کے لحاظ سے اُن سے درجہ وار اُوپر بیٹھ کر تماشہ دیکھتے ہیں۔ یہاں پر نشستوں کا انتظام بالکل اُلٹا ہوتا ہے۔ تمام دن بھر کے تھکے اور خستہ حال مزدور سب سے اُوپر بیٹھکر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پورے کھیل کا صحیح معنوں میں یہی طبقہ روح رواں ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو گانوں کی زور زور سے فرمائش کرتے ہیں۔ اور ہر قسم کا شور و غوغا۔ گالیاں۔ فقرے۔ چیخ و پکار۔ یہ سب انہی کا حق ہوتا ہے۔ اُن کی فلک شگاف آوازیں اُن کی مفلسی کی ساتھی اور ایک حد تک نقیب ہوتی ہیں۔ جن سے وہ اپنے جوش و خروش کا اظہار کرتے ہیں۔

اوسط درجہ کا طبقہ اس قدر زور و شور نہیں بتلاتا جیسا کہ یہ مزدور پیشہ طبقہ کرتا ہے۔ اور نہ اُن میں اتنا ضبط اور استقلال ہوتا ہے جتنا کہ اس غریب جماعت میں اُن کے چہروں پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مجھ جیسے یہ بھی اجنبی ہیں۔ اور اکثر یہ لوگ کھیل کے دوران میں سگرٹ کھانے۔ کھیل کا مختصر خلاصہ پڑھتے۔ اور آپس میں اشارہ بازی کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو سب سے نیچے اور آخری حصے میں بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو شاعر۔ ڈرامہ نویس۔ اور اداکاروں کا نقاد سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر تماشہ دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ تماشہ دکھانے

کے لئے آتے ہیں۔ اس کے قطع نظر۔ یہ لوگ اس بات کے متمنی ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کی قابلیت اور لیاقت کا اعتراف کریں اور اسی انداز سے وہ مجمع پر نظر ڈالتے ہیں۔ میرے ساتھی نے کہا دوست اصل واقعہ یہ ہے کہ سو میں سے ایک بھی اصول تنقید سے واقف نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود۔ یہ لوگ اپنے آپ کو بہت بڑا لائق نقاد اور مُتبصر فن خیال کرتے ہیں۔ ان کی اس جرءت کی وجہ سے کسی شخص کو یہ ہمت نہیں ہوتی کہ اُن کی روباہ بازیوں کا پول کھول دے۔ اور اسی ڈھیل کی وجہ سے سب کے سب اپنے آپکو نقاد سمجھنے لگے ہیں۔ صرف اسی حد تک نہیں بلکہ خانہ داری کے ہر مسئلہ میں وہ بلا تکلف اظہار خیال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ماہر فن خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ "باکس" میں بیٹھتے ہیں۔ اُن کی حالت واقعی میں قابل افسوس ہوتی ہے۔ عموماً ناظرین تماشہ دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ مگر یہ لوگ خود اپنا تماشہ دکھانے کے لئے آتے ہیں۔ ایسی حالت میں۔ میں ان گوں کو "تماشہ گننگ" "ڈوڈ سب شو" کا اداکار سمجھتا ہوں۔ ان کی خصوصیات بھی عجیب ہیں۔ جب کبھی اسٹیج پر کوئی خاص دلچسپ اداکاری پیش کی جائے گی یا کوئی لطیف مذاق ہو رہا ہو۔ تو یہ لوگ اظہار پسندیدگی میں نہ تو خفیف سا سر ہی ہلائینگے اور نہ تو کوئی کلمۂ تعریف ہی اُن کی زبان سے نکلیگا۔ صرف یہی نہیں جب کبھی کوئی سولی پر لٹکانے کا یا کسی کو قتل کرنے کا منظر دیکھیں گے تو اُس کے لئے کوئی اظہار افسوس نہ ہوگا۔

اور نہ کوئی مسکراہٹ ہی پیدا کی جائیگی۔

معزز اشخاص اور نازک اندام لیڈیاں اپنی اپنی عینکوں سے تماشہ دیکھا کرتی ہیں۔ میری اس دریافت پر میرے ساتھی نے کہا۔ دوست یہاں جتنی لیڈیاں اور جتنے جنٹلمن بیٹھے ہیں۔ اور جن کے عینکیں چڑھی ہوئی ہیں۔ یہ تمام اچھے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اندھا نہیں ہے ہاں البتہ فیشن کے خاطر یہ لوگ ضرور عینک لگائے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر شخص ایک دوسرے کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ ایک دوسرے پر فتح حاصل کرلے۔ اسٹیج کی روشنی تھیٹر کی موسیقی۔ نوجوان لیڈیوں کے لباس۔ خوش رو نوجوان سب کے سب یہی چاہتے ہیں کہ کوئی ہمیں گھورتا رہے۔ اور ہر شخص ہمارے حسن وزیبائش کی ستایش کرتا رہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دل کو انسانی شیخی اور اس کی ناپائیدار مسرت میں بالکل محو کر دیتے ہیں۔

آخر کار تماشہ کا وقت آگیا۔ پردہ اُٹھا۔ اور اسٹیج پر اداکار نظر آنے لگے۔ ایک عورت جو ملکہ کا پارٹ ادا کر رہی تھی۔ اُس نے آتے ہی سب کے سامنے اپنی گردن جھکا دی۔ اور اپنی اطاعت ووفاکیشی کا اُس نے کافی ثبوت دیا۔ ناظرین اُس کی اس بے محل ادا پر بہت خوش ہوئے۔ اور خوب تالیاں بجائی گئیں۔ انگلستان میں کسی ادا یا اداکار پر تالیاں بجانا اظہار پسندیدگی خیال کیا جاتا ہے۔ بظاہر اگرچہ کہ یہ بدتمیزی ہے۔ لیکن تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہر ملک کے رسم ورواج

جُداگانہ ہوتے ہیں۔ اور ہر ملک کی کچھ خصوصیات بھی ہوتی ہیں۔ یہ دیکھکر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اداکارہ جو اسٹیج پر اپنے آپ کو ملکہ تصور کر رہی تھی۔ اُس سے ایسی قابل اعتراض حرکت کا سرزد ہونا قطعاً ناقابل معافی ہے۔ پبلک میں اور اُس ایکٹرس میں تعارف ہو جانے کے بعد مکالمہ ایک نوجوان کے ساتھ شروع ہوا جو اس ملکہ کا رازدار تھا۔ دونوں نے اپنی حالت نہایت رنجیدہ بنائی تھی۔ ظاہر یہ کیا جارہا تھا کہ پندرہ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ جب کہ ملکہ نے اپنا ایک لڑکا کہیں کھو دیا تھا۔ مگر اُس کے فراق میں وہ اب تک نالاں ہے اور یہ اظہار غم اُسی کا نتیجہ ہے۔ وہ نوجوان رازدار جو اُس کا شریک غم تھا۔ وہ بھی نہایت زور زور سے رو رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ صبر کی بھی تلقین ہو رہی تھی لیکن وہاں صبر کا کوئی اثر نہ تھا۔ اور ملکہ اِن کلمات کو یاد ہوائی سمجھ رہی تھی۔ اس اثنا میں اُس کا شوہر آتا ہے۔ وہ ملکہ کی اس رنج و غم کی حالت دیکھ کر بہت متاسف ہوتا ہے۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ بظاہر وہ بہت مغموم نظر آ رہا تھا۔ آخر کار تین سین تک رونے چلانے کے بعد پہلے ڈراپ کے لئے پردہ گرا دیا گیا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ حقیقت میں یہ بادشاہ اور ملکہ دونوں بڑے بدقسمت واقع ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہم جیسے منکسر المزاج لوگوں کا ایسی اداکاری میں حصہ لینا جس کو کہ وہ عمومی فہم سے بالاتر اور آزاد سمجھتے ہیں۔ خصوصاً

ہم جیسوں کے لئے یہ مشکل کام ہے۔

ابھی میں اسی خیال میں الجھا ہوا تھا کہ پھر پردہ اُٹھا۔ اس مرتبہ بادشاہ نہایت غصہ میں اسٹیج پر دکھائی دیا۔ اُس کی ملکہ بھی وہاں موجود تھی۔ جس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بادشاہ کے حکم کو ٹھکرا رہی ہے۔ اور اس کی تلقین کو قبول نہیں کر رہی ہے۔ اور شاہی ہمدردی و محبت کو نظر انداز کر رہی ہے۔ نیز بادشاہ کے بھی انداز سے یہ پتہ چل رہا تھا کہ اس نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ ملکہ کو ذلت کی نظر سے دیکھے گا۔ بادشاہ کے غصہ میں آنے کے بعد دوسرے ایکٹ میں ملکہ کو غصہ میں بپھرتا ہوا بتلایا گیا۔ اس کے بعد پردہ گرا دیا گیا۔

اب میرے ساتھی نے کہا کہ یہ دیکھ کر آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ بادشاہ بڑا جوانمرد اور مستقل مزاج انسان ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ حساس طبیعت کا بھی مالک ہے کہ بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ اگر کسی وقت ملکہ کی طرح کوئی غمگین انسان اس کے اس رنج و غم کی خاطر خواہ ہم نوائی کرے اور ملکہ کو اُس کی حالت پر چھوڑ دے۔ تب اُس کے خیالات اور اس کے جذبات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ بادشاہ کی طبیعت ملکہ سے بالکل متضاد ہے وہ موت کے نام سے کانپنے لگتا ہے۔ لیکن موجودہ سوسائٹی میں اور خصوصاً نوجوان طبقہ میں موت کا تخیل ایک تصویر خیالی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے پر جان فدا کرتے نظر آتے ہیں۔ اور پھر

ایسا بھی منظر دکھائی دیتا ہے کہ سینہ میں خنجر بھی جھنکے ہوے ہیں۔ خنجروں کا سینہ میں اُتارنا اور مُنہ سے مُنہ ملا کر محبت کے بوسے لینا۔ یہاں دونوں یکساں قیمت رکھتے ہیں۔ یہ تمام باتیں سُن کر میں اپنے ساتھی کے اعتراضات کی من و عن تائید کرنا چاہتا تھا کہ میری توجہ ایک نئی چیز کی طرف منعطف ہو گئی۔ یعنی یہ کہ ایک شخص ایک گھاس کے تنکے کو ناک کی نوک پر رکھ کر خود ادھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اور اپنے "بیلنس" کا اچھا مظاہرہ کر رہا تھا۔

حاضرین نے اس کے اس کمال پر بے حد تعریف کی اور خوب تالیاں بجائی گئیں۔ میں نے پوچھا آخر یہ ظریف اسٹیج پر کیسے آیا۔ کیا ڈرامہ میں اس کردار کا بھی حصہ ہے۔ نالائق۔ پاجی۔ بیہودہ۔ کہیں کا۔ یہ دیکھ کر میرے ساتھی نے کہا۔ حضور آپ اس کو لغو۔ مُہمل اور غیر مہذب خیال کر رہے ہیں۔ حالانکہ تماشہ بھر میں اس سے زیادہ اور کوئی اہم کردار نہیں ہے۔ ناظرین یا سامعین کسی ادا یا کسی گانے سے اس قدر محظوظ نہیں ہوتے جس قدر اس کے تنکے کو رکھ کر ناچنے سے مسرور ہوتے ہیں۔ اس چھوٹے سے تنکے میں ایک دنیا پنہاں ہے۔ اُس کی ہر حرکت پر لوگ جان دیتے ہیں۔ اور یہاں ہر وہ شخص جس میں اس قسم کی ذکاوت۔ عیاری۔ بیہودگی۔ اور چالاکی ہو وہ تو خوب پیسے کما سکتا ہے۔

اس کے بعد تیسرا ایکٹ شروع ہوا۔ ایک اداکار اسٹیج پر آیا اور کہنے لگا معزز حاضرین میں تماشے کا بدمعاش ہوں۔ اور تماشے کے

ختم پر میں آپ صاحبین کو چند نئے کمالات دکھاؤں گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ساتھ ایک شخص کو اور لیکر آیا جو بدمعاشی اور شرارت میں پہلے شخص سے بھی چار ہاتھ بڑھکر تھا۔ ان دونوں نے اپنی چالاکی۔ بٹے بازی اور چھچھوری حرکات کا کافی مظاہرہ کیا۔ اس پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کیوں جی اگر وہ بدمعاش تھا تو اُس کی یہ سخت بے وقوفی تھی کہ بلا کسی کے استمزاج کے وہ ناظرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ حضرات میں تماشہ کا بدمعاش ہوں۔ اس قسم کے مکالمے اور خود سے مخاطبت کی تقریریں کبھی ہمارے یہاں چین میں نہیں ہوتیں۔ اور نہ ان چیزوں کو تماشہ کا ایک جزِ اعظم قرار دیا جاتا ہے۔

ابھی ہم دونوں آپس میں یہی کہہ رہے تھے کہ پھر تھیٹر تالیوں کی گونج سے بیدار ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکا جو تقریباً چھ سال کا ہو گا اسٹیج پر ناچ کی مشق کر رہا ہے۔ جس سے تمام لیڈیاں۔ مقدس پادری۔ اور نوجوان لڑکے سب ہی خوب محظوظ ہو رہے ہیں۔ اور اچھی داد و تحسین دے رہے ہیں۔ میں نے یہ دیکھ کر کہا افسوس کتنا. کمسن لڑکا ہے۔ مگر ابھی سے اُس کے جذبات مشتعل کئے جا رہے ہیں۔ اور اُس کو بُری صحبتوں میں رنگا جا رہا ہے۔ کیا یہاں ناچ کو ہمارے یہاں چین کی طرح بے حیا اور غیر مہذب نہیں خیال کیا جاتا۔ اس پر میرے ساتھی نے کہا جی نہیں یہاں بالکل متضاد خیال ہے۔ یہاں ناچ کود۔ بے شرمی۔ بے حیائی۔ عُریاں نوازی۔ یہ سب مہذب فنون

لطیفہ میں شمار کی جاتی ہیں۔ یہاں پر آدمی دماغ سے زیادہ پیروں کی محنت سے کما سکتا ہے۔ وہ شخص جو تین چار مرتبہ اپنے پنجوں پر کھڑے رہکر گھوم سکتا ہے۔ اور قبل اس کے وہ زمین چھولے۔ اپنے انگوٹھوں کو ویسا ہی برقرار رکھے۔ اس کمال پر وہ سال بھر میں تین سو پونڈ کما سکتا ہے۔ اور جو شخص چار مرتبہ یہی حرکت کر سکتا ہے۔ وہ چار سو۔ اور پانچ مرتبہ کرنے والا پانسو۔ بلکہ اس سے زیادہ بھی اُس کی تنخواہ ہو سکتی ہے۔ بہرکیف کوئی کمال رکھتا ہو۔ صنف نازک میں اُچھلنے۔ کودنے۔ اور تھر کنے والیوں کی بے انتہا قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ان پریوں کے لئے اُن کی یہ خوشخرامی کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔ مگر یہاں کے مرد اُن کی تیزی اُن کی کبک رفتاری۔ اُن کی اداؤں پہ اپنی جان تک قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اور یہاں وہ ناچنے والی سب سے زیادہ تعریف کی مستحق قرار دی جاتی ہے۔ جو سب سے اونچا اُچک سکے۔ اچھا یہ سب چھوڑو۔ دیکھو وہ چوتھا ایکٹ شروع ہو رہا ہے۔ ہم کو اُس طرف متوجہ ہو جانا چاہیئے۔

اس چوتھے ایکٹ میں یہ بتلایا گیا تھا کہ ملکہ کا وہ گمشدہ لڑکا جو ایک مدت سے غائب تھا وہ مل گیا ہے۔ اب وہ لڑکا نوجوان۔ خوبصورت۔ وجیہہ۔ اور کئی صفات کا مالک ہو چکا تھا۔ ملکہ کا یہ خیال تھا کہ اب عقلمندی اس میں ہے۔ کہ حکومت کا تاج و تخت اپنے لڑکے کے سپرد کر دیا جائے۔ اور حقیقت بھی یہ تھی کہ شوہر کے سر سے زیادہ

موزوں بیٹے کا سر تھا۔ شوہر کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ وہ نرا بے وقوف اور گاؤدی ہے۔ بادشاہ کو ان خیالات کا پتہ چل چکا تھا۔ اور وہ بھی گہری فکر میں تھا۔ بادشاہ کو ملکہ بھی عزیز تھی اور وہ رعایا سے بھی محبت کرتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے یہ تجویز کی کہ کسی طرح سے اِن دونوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنے لڑکے کے وجود کا خاتمہ کر ڈالا جائے۔ تاکہ یہ خدشہ ہی باقی نہ رہے۔ ملکہ کو اُس کی اس شقاوت۔ بربریت، وحشت اور اس شیطانیت پر سخت غصہ آیا۔ اور اسی حالت میں وہ بے ہوش ہو گئی۔ جس پر پردہ گرا دیا گیا۔ اور ایکٹ ختم کر دیا گیا۔ میرے ساتھی نے کہا دیکھا آپ نے ڈرامہ نویس کا کمال۔ جب ملکہ کچھ نہ کہہ سکی وہ جھٹکے سے بے ہوش گرا دی گئی۔ اس وقت اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ملازمہ اُس کو سنبھالے ہوئی تھی۔ کیا ایسے سینوں سے پبلک پر خوف کے آثار طاری نہیں ہوتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہوتے ہیں۔ ہم کو ہی دیکھ لو۔ بال بال خوف سے کھڑا تھا۔ اور آج کل کے مروجہ ڈراموں میں بے ہوشی ایک لازمی اور لابدی شئے قرار دی گئی ہے۔

اس کے بعد پانچواں ایکٹ شروع ہوا۔ یہ ایکٹ پچھلے سینوں سے زیادہ سامان والا معلوم ہو رہا تھا۔ اس میں فوری بدلنے والے سین بھی تھے۔ مختلف قسم کے ساز بج رہے تھے۔ ایک مجمع بے ہنگام کا شور وغوغا۔ عمدہ نفیس قالین بچھے ہوئے تھے۔

چوکیدار ہر طرف دربانی کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ مختلف قسم کے دیوتا۔ شیاطین۔ بھوت۔ دیو۔ خنجر۔ چوہے مارنے کی دوائیں پرانے کپڑے۔ بہرکیف یہاں سب ہی کچھ بلا بدتر موجود تھا۔ لیکن یہ مجھے یاد نہ رہا کہ بادشاہ مار ڈالا گیا یا ملکہ خود ڈوب مری۔ یا ولیعہد کو زہر دے دیا گیا۔ جب کھیل ختم ہوگیا تو یہ میں نے دیکھا کہ تماشہ کے جملہ اداکار ابھی تک ویسے ہی پژمردہ اور غمگین بنے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا حقیقت میں یہ کمال ہے کہ پانچ ایسے لمبے لمبے ایکٹ تک اپنی قنطوبیت کو برقرار رکھنا۔ یہ اُنہی کا کام ہے۔

اس وقت مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔ جب کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ کوئی اداکار زیر لب ہی کوئی تقریر کر رہا ہے۔ مجھے اُس سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ سوائے چند اشاروں اور مُنہ کھولنے کے مجھے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ دوران تماشہ میں بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ میں خواہ مخواہ کے اشارات سے کچھ متوجہ ہوگیا۔ لیکن وہ اس قدر مہمل اور ذلیل تھے کہ مجھے نیند آنے لگی۔ یا تو یہ کہیے کہ اُن کے رنج وغم کی وجہ سے میں خود بھی بے انتہا متاثر ہوگیا تھا کہ مجھے کسی چیز میں لطف نہیں آرہا تھا۔ ڈرامہ نویس یا اداکار میں کوئی ایسی بات ہونی چاہیئے جو پبلک کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔ ادنیٰ طبقہ کے لوگ اُن کا نام چمکانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی کوئی اداکار کوئی سوز وغم کا پارٹ کرنا چاہتا ہو تو اُس کو اس قدر اصلیت پیدا

کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ تمام حاضرین بھی اپنے آپ کو غمزدہ اور مصیبت زدہ تصور کرنے لگیں۔ اُس کو ناظرین سے تعریف کے نعروں اور تالیوں کی گونج کی پروا نہ کرنی چاہیئے۔ اور یہ سب باتیں اُسی وقت ہوسکتی ہیں۔ جبکہ تماشہ میں بھی دلکشی۔ اور موثر ادائیں موجود ہوں۔

جب تماشہ ختم ہوگیا اور ہال میں سے سب اپنے اپنے گھر جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ کچھ چلنا بھی شروع ہو گئے۔ کچھ آہستہ آہستہ کھسک رہے تھے۔ ہم دونوں بھی مجمع میں سے ہو کر چلنے لگے۔ اتفاق سے ایک گلی میں سے جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں بہت سی گاڑیاں اور پالکیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اور سب یہی کوشش کر رہی تھیں کہ ہم آگے بڑھ جائیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جنگل میں ایک درخت پر سے چڑیاں اُڑ اُڑ کر آگے پیچھے جا رہی ہیں۔ کئی جگہ آگے پیچھے مڑنے کے بعد آخرکار ہم لوگ اپنے گھر پہونچ گئے۔ اچھا خدا حافظ۔

پانچواں خط

مرد سیاہ پوش کی عادات و اطوار

اور اُس کے چال و چلن کی ناموافقت کے کچھ واقعات

اگرچہ میں دوستی کا بہت شائق ہوں۔ لیکن ملاقات میری چند ہی سے ہے۔ سیاہ پوش جس کا کہ میں کئی بار تذکرہ کر چکا ہوں۔ حقیقت میں وہ میرا دوست ہے۔ اور یہ میری دلی تمنا ہے کہ وہ میرا دوست بنا رہے۔ میں اُس کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ اور وہ اس کا مستحق بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُس کے عادات و اطوار بالکل عجوبہ روزگار ہیں۔ اُس کی مثال ایسی ہے کہ ایک ہنسنے والی قوم میں کا ایک ہنسنے ہنسانے والا فرد ہو۔ کبھی تو وہ اس قدر سخاوت پر تُل جاتا ہے کہ کنجوسی بھی اُس سے متاثر ہو جاتی ہے۔ یوں تو بظاہر اُس کی گفتگو ترش اور بے معنی سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُس کا دل محبت سے معمور ہوتا ہے۔ یوں تو عام طور پر لوگ اُس کو آدمیوں سے نفرت کرنے والا سمجھتے ہیں۔ لیکن میں بعض اُس کے ایسے مواقع بھی دیکھا ہوں۔ جبکہ انسانی ہمدردی اور جوش و خروش کی وجہ سے اُس کے رُخساروں پر سُرخی دوڑ آئی تھی۔ اور اُس کی نظروں سے رحم ٹپک رہا تھا۔ لیکن بظاہر وہ نہایت نفرت آمیز

کلمات اپنے منہ سے نکال رہا تھا۔ بعض افراد انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کو بڑی چیز خیال کرتے ہیں۔ اور چند لوگ ان چیزوں کو اپنی خلقی چیز سمجھ کر اس پر ناز کرتے ہیں۔ لیکن صرف یہی ایک شخص مجھ کو ایسا نظر آیا جو فطری سخاوت کو یوں چھپ چھپ کر کرے کہ دوسروں کو اس بات کا پتہ نہ چل سکے۔ وہ انتہائی کوشش اس بات کی کرتا ہے کہ کسی شخص پر اس کی ہمدردی اور سخاوت ظاہر نہ ہو جائے۔ اور اس کے برخلاف ایک خوشامدی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی جھوٹی تعریف کو اس کا ممدوح من وعن یقین کر لے۔ لیکن اس کو وہ کیا کریگا۔ جبکہ ہر موقع پر اس کے جذبات اس کے پوشیدہ ارادوں کی نقاب کشائی کر دیتے ہیں۔ اور ان سے اس کے صحیح خط و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ابھی چند یوم کا ذکر ہے کہ ہم ایک گاؤں جاتے ہوے راستہ میں مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ تذکرۃً اس کا بھی ذکر آ گیا کہ غریب اور مفلس لوگوں کے لئے انگلستان میں جو انتظام کیا گیا ہے وہ ہر معنی سے قابل داد ہے۔ اس پر اس نے اپنے تعجب کا اظہار کیا کہ کیوں ہمارے ملکی دولتمند لوگ اس قدر رقم ان خیرات خانوں پر صرف کر رہے ہیں۔ جبکہ حکومت نے خود ان کے خورد و نوش کا کافی بندوبست کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ہر ایک خیرات خانہ میں غریبوں کو کھانا کپڑا بستر اور تاپنے کے لئے آگ دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور ان لوگوں کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ وہ لوگ ان چیزوں پر

ہرگز قانع نہ ہوتے ہونگے۔ سب سے زیادہ تعجب مجھے مجسٹریٹ مقامی پر
آتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو چن چن کر کارخانوں میں کیوں نہیں بھیج دیتا
جو کہ اس طرح سے ملک وقوم اور صنعت و حرفت پر بار معلوم ہو رہے
ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ محنت سے جی چراتے ہیں
اور جب کبھی ٹھنڈے دل سے اپنی فرسودہ حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کو
بہتر بنانے کی تدابیر بھی اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ سستی۔ کاہلی۔ اور مفلس پن
کو کام میں لاتے ہیں۔ اگر میں کسی شخص کو کھلے ڈولے نصیحت کرنے کی
جرأت کروں تو میں صاف طور پر یہ بات اس کے ذہن نشین کرادونگا
کہ وہ کبھی چوری، دغابازی۔ عیاری اور سٹہ بازی کو کام میں نہ لائے۔
لیکن یہاں جناب۔ یہ طبقہ کا طبقہ پورا گرہ کٹ اور عیار ہوتا ہے۔ اُن کو
تو بجائے آرام و عافیت کے جیل کا مکان زیادہ پسند ہوتا ہے۔

وہ مجھے منع ہی کر رہا تھا کہ خبردار آیندہ سے کبھی ایسی غلطی
نہ کرنا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ کبھی نرمی اور مہربانی کا برتاؤ نہ کرنا
کہ سامنے سے ایک غریب بوڑھا آتا ہوا نظر آیا۔ جس کی گدڑی بھی
عجب بہار کی تھی۔ وہ سامنے آتے ہی ہم لوگوں سے رحم و کرم کا طالب
ہوا۔ اُس نے کہا حضور میں کوئی بھیک منگا۔ فقیر نہیں ہوں بلکہ ضرورت
کے ہاتھوں مجبور ہو کر باہر نکلا ہوں۔ اس لئے کہ گھر میں میری بیوی اور
پانچ چھوٹے چھوٹے بچے فاقوں سے مر رہے ہیں۔ اُس کی اس داستان
کو میں نے تو بالکل فرضی اور گھڑی ہوئی خیال کیا۔ لیکن سیاہ پوش پر

ں سکا برعکس اثر ہوا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اُس کے اس غمگین قصہ سے
ہ خود متاثر ہوا ہے۔ اور اس کی تکالیف کو دور کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کے
ع نظر میں نے یہ آسانی سے معلوم کر لیا کہ وہ پانچ بھوکے بچوں اور غریب
رت کی جان بچانا چاہتا ہے لیکن چونکہ وہ اس طبقہ کے خلاف تھا۔
ں لئے موقع کا متلاشی ہے کہ نظر بچے تو کچھ اُس کے ساتھ سلوک
دوں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مخالفت اور موافقت کے درمیان
نسا ہوا ہے۔ چنانچہ میں موقع پر کھسک گیا۔ جیسے ہی میں وہاں سے ہٹا
ں نے دیکھا کہ وہ اُس غریب شخص کے ہاتھ میں چپکے سے ایک چاندی
سکہ رکھ دیا۔ اور زور سے ڈانٹ کر کہنے لگا کہ چلو۔ یہاں سے کیوں
ت تم لوگ محنت و مزدوری کرتے اور اپنی روٹی خود کماتے ہو۔ اس
ے کیا حاصل کہ آنے جانے والوں کو خواہ مخواہ سوالات کی بوچھار سے
یشان کیا جائے۔ چل نکل۔ یہاں سے نامعقول کہیں کا۔

جب اُس کو یہ اطمینان ہو گیا کہ اب کوئی ہمارا پیچھا نہ کرے گا۔
اُس نے پھر اُن فقیروں کی مذمت کا مرثیہ شروع کر دیا۔ اُس نے
ئ قصے مسلسل حصوں میں کفایت شعاری۔ اور بدمعاشوں کے پہچان
ے کے بیان کئے۔ کہ وہ کس طرح سے عیاروں سے واقف ہو جاتا ہے۔
ں نے کہا مجھے ان فقیروں کے بہت سے ہتکنڈے معلوم ہیں۔ اگر
ے کاش! میں مجسٹریٹ ہوتا تو یقینی جیل کے دروازے ان لوگوں کے
ے کھول دیتا۔ اُس کے بعد پھر اُس نے وہ قصہ بیان کیا کہ دو شریف

خاتون کس طرح سے ان بدمعاشوں کے ذریعہ سے اُڑ گئیں۔ ابھی وہ تیسرا واقعہ بیان ہی کرنا چاہتا تھا کہ ہمارے سامنے ایک لنگڑا ملاح جس کا ایک پیر لکڑی کا تھا نازل ہوا۔ اور عین ہمارے راستہ پر آکر کھڑا ہو گیا اُس نے اللہ بھلا کرے۔ آپ کے بال بچوں کو سلامت رکھے۔ آپ کو تنومند اور باصحت رکھنے کی دعا کرنے لگا۔ میں نے اُس کی ان صداؤں کا کوئی خیال نہیں کیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرا نرم دل دوست اس سے بھی پسیجا جا رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے مجھے روک لیا۔ اور وہیں کھڑے کھڑے اُس کی عیاری اور اُس کے جھوٹے سوالات پر تبصرہ کرنا شروع کر دیا۔

اب اُس نے اُس پر ایک گہری نظر ڈالنی شروع کی۔ اور غصہ سے اُس پر سوالات کرنے شروع کر دئے۔ کہ وہ پہلے کس محکمہ میں ملازم تھا۔ اور کیوں وہ اپنی خدمت سے علیٰحدہ کر دیا گیا۔ اب اس وقت وہ کیوں گداگری اختیار کئے ہوا ہے۔ اس دریافت پر ملاح کو بھی غصہ آ گیا۔ اور اُس نے بھی نہایت کرخت لہجے میں کہنا شروع کیا کہ جناب میں ایک خانگی جہاز اور وہ بھی جنگی جہاز کا افسر اعلیٰ تھا۔ اور اس نے ٹانگ اُن لوگوں کے مقابلہ اور اُن کی مدافعت میں کھو دی ہے۔ جو کہ گھر ہی میں بیٹھے ہوئے باتیں بنایا کرتے ہیں۔ یہ سُن کر ہم دونوں دم بخود ہو گئے۔ اور میرے دوست نے تو ارادہ کر لیا کہ اب کوئی سوال نہ کرے گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ طریقے بھی دریافت کر رہا تھا کہ اس کو کس طرح سے دفعہ کیا جائے۔ بظاہر کوئی ادا کاری خصوصاً اس موقع

کے لئے کارگر ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اور میرے سامنے وہ برابر ان لوگوں سے نفرت ظاہر کر رہا تھا۔ اُس نے مناسب یہی خیال کیا کہ کسی طرح سے بھی اس ملاح سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُس نے ملاح کی پیٹھ کے اوپر ایک گٹھڑی کو دیکھا۔ میرے دوست نے کہا۔ کیوں جی تم ان دیاسلائیوں کو کتنے میں بیچو گے۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس وقت تک جواب کا انتظار کرتا وہ خود ہی کہنے لگا ہونگی یہی ایک شلنگ قیمت کی ہونگی۔ اُس کی اس طلب پر ملاح کو بڑا تعجب ہوا۔ لیکن فوراً ہی اپنے ہواس مجتمع کر کے کہنے لگا سرکار آپ پورے اس بنڈل کو لے سکتے ہیں۔ حضور آپ اس پورے سامان کو میری دعاؤں کے صلہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔

میں آپ سے اس وقت کا منظر نہیں بیان کر سکتا۔ جبکہ میرا دوست اس نئے سودے کے خریدنے سے خوش اور فتحمند نظر آرہا تھا۔ اُس نے مجھے یقین دلانا شروع کیا۔ اور اپنا مستقل ارادہ ظاہر کرنے لگا کہ یہ لوگ چور بھی ہوتے ہیں اور ادھر اُدھر سے چیزیں اُڑا کر یونہی اونے پونے فروخت کر دیا کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اس نے اپنے اس نئے سودے کی تعریف کرنا شروع کی کہ وہ کس طرح سے ان کاڑیوں کو کام میں لائیگا۔ اور اس پر اچھی خاصی تقریر کرنے لگا کہ۔ یہ شمع جلانے میں بہت مفید ثابت ہونگی۔ بجائے اس کے کہ اُن کو چولہے میں جھونکدیا جائے۔ ان کا بہتر استعمال اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اُس نے

کہا جب میں کبھی بلا وجہ اور بلا کسی جائز طلبگار کے رقم کسی پر خرچ کرتا
ہوں تو مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے ایک دانت اپنا کھو دیا۔
میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کب تک کفایت شعاری اور کارٹیوں کے فوائد
کی تعریفیں ہوتی رہیں۔ اور اس غم زدہ انسان سے ہمدردی کا اظہار
ہوتا رہا۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک عورت نہایت بوسیدہ چیتھڑوں
میں نظر آئی۔ ایک لڑکا اس کی گود میں تھا۔ ایک پیٹھ پر لدا تھا۔ وہ
گانا گانے کی کوشش کر رہی تھی مگر بوجہ نقاہت اس کے منہ سے آواز
نہیں نکل رہی تھی۔ وہ گانا گا رہی تھی لیکن آواز اس قدر رنجیدہ تھی
گویا کہ وہ رو رہی ہے۔ ایک ایسی شخصیت جو انتہائی رنجیدہ ہو۔ وہ
اپنی بیجا کوشش کی باعث میرے دوست کے لئے مذاق کا کام دے رہی
تھی۔ اور وہ حتی الامکان اس سے کنارہ کش ہونے کی فکر میں تھا۔
اس کی جلد بازی اس کی گفتگو اس موقع پر خواہ مخواہ اس کو پریشان
کر رہی تھی۔ آخر کار اس سے نہ رہا گیا۔ اور اس نے میری موجودگی
ہی میں اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ڈھونڈنے لگا۔ تاکہ اس عورت
کو آزاد کر دے۔ لیکن اس وقت وہ بہت ہی خجل ہو رہا تھا جب کہ
اس کی جیبوں میں ایک پائی بھی نہیں تھی۔ اور تمام رقم جو کچھ کے
اس کے پاس تھی۔ سب کو وہ بانٹ چکا تھا۔ تکلیف رنج و غم کے آثار
اس عورت کے چہرے سے عیاں تھے۔ لیکن یہاں اس پر بھی نہایت
صدمہ طاری تھا۔ اس لئے کہ اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں تھا چھوڑ

دیر تک وہ ادھر اُدھر اُلٹ پلٹ کرکے ڈھونڈتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد
وہ سوچ کر اپنے آپ کو غمگین بنا لیا۔ اس لئے کہ اُس کی فطرت نہایت
پاکیزہ تھی۔ چونکہ اُس کے پاس پیسے نہیں تھے اس لئے اُس نے ایک
پلنگ کی قیمتی دیا سلائیاں سب اُس کے ہاتھ میں رکھ دیں۔

چھٹا خط

سیاہ پوش کی سوانح عمری

غیر متوقع طور پر میرے دوست میں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔ لہذا مجھے
انہیں نظر انداز نہ کرنی چاہئیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر
اُس کا اس سے کیا مطلب ہے کہ نیکیوں کو پوشیدہ رکھا جائے۔ جس کو
عموی لوگ بڑھا چڑھا کر کے بیان کرتے ہیں۔ میں سیاہ پوش کی سوانح عمری
معلوم کرنے میں ناکامیاب رہا۔ جس کی بنی نوع سے ہمدردی ایک عالمگیر
چیز تھی۔ اور جس کے پاس دینے دلانے کے لئے کوئی وجہ اور سبب نہیں
تھا۔ میرے تعجب میں اضافہ کرنے کے لئے وہ ہمیشہ نئے نئے قصے انہی
لوگوں سے متعلق سنایا کرتا تھا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ اگر آپ میری
سوانح عمری معلوم کرنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ تو آپ کو معلوم
ہونا چاہئے کہ مجھے کئی اتفاق ایسے ہوئے ہیں جبکہ میری جان جاتے

ہوئے بال بال بچی ہے۔ تقریباً بیس سال سے میں عسرت کی زندگی گذار رہا ہوں۔ مگر فاقہ کشی کا اتفاق بہت کم ہوا ہے۔

میرا باپ اپنے خاندان کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ اور گرجا میں ایک معمولی جگہ پر ملازم تھا۔ اُس کی علمی لیاقت اُس کی قسمت سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ اور اُس کی سخاوت اُس کی علمی قابلیت سے بہت زیادہ بلند تھی۔ اس مفلسی اور تہی دامنی پر بھی چھتیڑوں میں اُس کے خوشامدی موجود تھے۔ جو اُس سے زیادہ بدترین حالت میں ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے حتی المقدور اِن لوگوں کو کھلایا پلایا کرتا تھا اور بدلے میں سوائے تعریف کے اور کوئی چیز لینے کا عادی نہ تھا۔ یہی خواہش ایک مطلق العنان شہنشاہ میں بھی ہوتی ہے۔ ایک فوج کے سپہ سالار میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہاں کھانے کی میز پر میرے باپ میں بھی موجود تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے "درخت ایوی" کا قصہ شروع کیا۔ لوگ اُس سے محظوظ ہوئے اور ہنسے۔ پھر اُس نے دو عالموں کی بحث کا مضحکہ اُڑایا۔ اُس سے بھی لوگ خوش ہوئے۔ اس کے بعد ایک "جوڑ برجس" کا قصہ نکالا۔ حاضرین نے خوب داد دی۔ لیکن اِن تمام سے بڑھا ہوا قصہ "ٹافی کی کرسی" والا تھا جس نے اہلِ مجلس کو بے ساختہ فلک شگاف قہقہوں کے لگانے پر مجبور کیا۔ اسی طرح سے اُس کی طبیعت مذاق پسند واقع ہوئی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ بتدریج مزاح میں زیادتی کیا کرتا تھا۔ وہ تمام دنیا سے محبت

کرتا تھا۔ اور اُس کا یہ خیال تھا کہ اہلِ دنیا مجھ سے بھی محبت کرتے ہیں۔

وہ بڑا ہی بدقسمت انسان تھا۔ اپنے لڑکوں کو تعلیم و تربیت کے لئے کسی قسم کی کوئی رقم چھوڑنے کا یا پس انداز کرنے کا اُس کا مطمحِ نظر نہیں تھا۔ وہ سونے چاندی سے زیادہ قیمتی تعلیم کو سمجھتا تھا اِسی خیال سے وہ ہم لوگوں پر رات دن ہمارے عادات و اخلاق دُرست کرنے میں ہماری تعلیمی خبر گیری کرنے میں اپنا بہت سا وقت صرف کیا کرتا تھا۔ اکثر ہم سے کہا گیا کہ بنی نوع کے ساتھ ہمدردی یہ اپنا فریضہ سمجھنا۔ اور دوسروں کی احتیاجوں کو پورا کرنے میں ایسی کوشش کرنا۔ جیسا کہ اپنی ضرورتوں کے لئے انسان کیا کرتا ہے ملٹن "جنت گم گشتہ میں" کہتا ہے کہ انسان کا چہرہ قدرت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لئے انسان سے عزت اور محبت سے پیش آنا ہر انسا کا نصب العین ہونا چاہئے۔ وہ شخص جو رحم و کرم کی بالکل نشین نگیا ہو۔ اور ہمارے ساتھ اُس کا سلوک قابلِ فہم ہو۔ اُس کو انسانی رنج و غم کے مناظر بتلا کر اُس کو رنجیدہ کر دینا ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اُس کا فریضہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ ہم اُس سے حاصل کرنے جاتے ہیں یا اُس کو غمگین بنانے جاتے ہیں۔ اور جس ضرورت سے ہم جاتے ہیں وہاں ایک پائی کی بھی مطلب براری نہیں ہوتی۔

میں اس خیال کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ باوجود شکوک بہات کے دور کرنے کے بھی کہ وہ خطری چالا کی جس کو قدرت

نے مجھ میں ودیعت کی ہے۔ اُس سے میں بچ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ میں ایسی دنیا میں پیدا کیا گیا ہوں۔ جہاں ہر قسم کی چالاکیوں اور عیاریوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ اور اگر اتنی سی بھی جرأت نہ ہوتی تو میری مثال اُن مقابلہ کرنے والوں میں سے ہوتی جو روم کے "ایمفی تھیٹر" میں خونناک جانوروں اور سانڈوں سے بلا کسی آلہ بچاؤ کے مقابلہ کیا کرتے تھے۔ بہر کیف میرا باپ جس نے صرف دنیا کے ایک ہی رُخ کو بغور دیکھا تھا۔ اُس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حق کی فتح میں کچھ اُس کا بھی حصہ ہے۔ اگرچہ کہ میرا سرمایہ خرد صرف خود میرے ہی موزوں حال کے عنوانات پر ختم تھا۔ اس لئے کہ موجودہ مصروف دنیا کے یہی عنوانات ہوا کرتے ہیں۔ لیکن اب وہ بالکل بیکار نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ مصروف دنیا کو اب ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ سب سے پہلا موقع ہے کہ مجھے اپنے ارادوں اور امیدوں میں ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہی میں تھا۔ جس نے یونیورسٹی میں بھی اپنے آپ کو خوش بخت ثابت نہ کر سکا۔ وہ اپنے آپ میں بعض اوقات نہایت مسرور نظر آتا تھا۔ کہ ایک نہ ایک دن میرا بیٹا بھی ادبی شہرت کا مالک ہوگا۔ لیکن اُس کو یہ دیکھ کر بہت ناامیدی ہوئی کہ یہاں اُس کے خیالات کے مطابق کوئی مواد ہی نہیں تھا۔ اور ہم نرے کورے ہی تھے۔ میری ذہنی ترقیوں

کے انحطاط سے دن بدن اُس کی نا اُمیدی بھی بڑھتی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھ میں ریاضی کے مسئلوں کے ثابت کرنے کی اہلیت ہی تھی اور نہ حافظہ و خیال ہی بلند پایہ کا تھا۔ اور جب کوئی نیا مسئلہ میرے سامنے حل کے لئے آجاتا میں پریشان ہوجاتا۔ اور ادھر اُدھر بغلیں جھانکنے لگتا۔ اس لاپرواہی۔ اس کُند ذہنی۔ اور اس نٹھس پن سے میرے اساتذہ بھی مجھ سے ناخوش رہتے لیکن پھر اس خیال سے تلطف کا اظہار کرتے کہ مجھ میں کوئی کیادی کا جوہر نہیں تھا۔ اور سب مجھے سادہ لوح اور بے ضرر انسان خیال کرتے تھے۔

سات سال تک کالج میں تعلیم پانے کے بعد میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ اور میرے باپ نے میرے لئے صرف دعاؤں اور آرزوؤں کے اور کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا۔ اُس وقت میری حالت اُس بے سہارا کشتی کی طرح تھی جس کے بادبان نہ ہوں۔ فطرۃً میں نیک طبیعت واقع ہوا ہوں لیکن دنیا میں چالاکیوں اور عیاریوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ میرا کوئی رہبر نہیں تھا جو مجھ کو صحیح راستہ پر گامزن کرتا۔ اور نہ میرے پاس کوئی زادِ راہ تھی۔ جو اس قدر طویل اور پُرخطر مفلسی کے راستہ میں کام آتی۔ ایسی حالت میں مجھے مجبور کیا گیا کہ میں اپنی صبر و قناعت اور مفلسی کی بے سہارا کشتی کو بائیس ۲۲ سال تک بلا کسی کے مدد کے کھیئوں۔ اور سمندری ہر قسم کی تکالیف سے مقابلہ کرتا رہوں۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے لئے اور اُس کو مناسب طریقہ

سے چلانے کے لئے میرے دوستوں نے مجھے اپنی بیش قیمت ارا سے
اگاہ کرتے رہے۔ لیکن ان دوست نما دشمنوں کی نصیحتوں اور را دل
میں بھی بربادی اور دشمنی کا پہلو مخفی ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے یہی
رائے دی کہ دیکھو مناسب طریقہ سے خرچ کرو اور ایک اصول کے
ساتھ آگے قدم بڑھاؤ۔

میری آزادی پر خود مجھے اختیار نہیں ہے۔ بعض اوقات
میرا دل چاہتا ہے کہ میں چھوٹے بالوں کی ٹوپی پہنوں۔ مگر میں مجبور
ہوں کہ لمبے بالوں کی ٹوپی استعمال کروں۔ کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ
میں بھورا لباس پہنوں لیکن میں مجبور کیا جاتا ہوں کہ سیاہ لباس
میں ملبوس ہوں۔ اور انہی قیود اور پابندیوں سے میرا دل اُلجھتا
ہے اور بالآخر میں اِن تمام کو ٹھکرا دیتا ہوں۔ انگلستان کا ایک
مقدس پادری چین کے ایک خدا ترس ناصح کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ صرف
زُہد تقوے میں یہی نہیں بلکہ ہر شئے میں وہ سب سے زیادہ کھاتا
ہے۔ اور تمام سے زیادہ زندہ رہنے کی ہوس کرتا ہے۔ میں فطرتاً
عیش و عشرت۔ غفلت و لاپرواہی۔ آرام و کاہلی کو ایک طفلانہ
تخیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ اور اب میرے دوستوں نے
سمجھ لیا ہے کہ میں دنیا میں کسی کام کا نہیں ہوں۔ اور پھر بھی وہ اُن
لوگوں پر رحم و کرم سے کام لیتے ہیں۔ جس کو دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل
بے ضرر اور خاموش انسان ہے۔

مفلسی خودداری کے جذبات کو فنا کردیتی ہے۔ اور میں اس خیال کو ایک امیر وکبیر کے خوشامدی کی طرح منظور کرتا ہوں۔ پہلے پہلے مجھے بڑا تعجب معلوم ہوا کہ ایک خوشامدی کا پوزیشن ایک امیر وکبیر کے دسترخوان پر کیسا ہوتا ہوگا۔ پھر مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہر طرح سے امیر کی ہمخیالی اپنا نصب العین سمجھ لینا چاہئے۔ اگر امیر کسی موضوع پر کوئی گفتگو کر رہا ہو تو اس کو بغور سنتا رہے۔ اور جب وہ ادھر اُدھر داد کی نظروں سے دیکھے تو خوب واہ واہ کیجائے۔ اور یہی تہذیب وشائستگی کے طریقے مانیں گئے ہیں جس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ تجربہ سے مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ میرا ممدوح امیر وکبیر مجھ سے زیادہ بے وقوف اور گاؤدی ہے۔ اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس وقت سے میری خوشامد کا خاتمہ بھی ہوگیا لیکن پھر مجھے اپنے خیالات کے مجتمع کرنے کی فکر ہونے لگی۔ اور یہ ارادہ کرلیا کہ آئندہ سے اس کی اہمال سرائیوں سے اجتناب کروں۔ اس لئے کہ خوشامد ایک فن ہے اور اس سے لوگوں کو خوش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تعریف اور بیجا تعریف اُن اشخاص کی کرنا جن کی خامیوں اور کمزوریوں سے ہم بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اُن کی خوشامد ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ جب کبھی میں نے اُن لوگوں کے لئے اپنے تعریف کے منہ کھولے۔ ہمیشہ میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت کرنا شروع کی۔ اور میں نے بیجا تعریف سے پرہیز کیا۔ ان چیزوں کو میرے مُربی امیر وکبیر نے خوب محسوس کیا۔ بالآخر اُن لوگوں نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ

آپ کسی طرح سے بھی نوکری کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ میں برخاست کر دیا گیا۔ اور میرے محسن بہی خواہ احباب جو ہمیشہ میری مدد پر تلے رہتے ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ایسا سادہ سیدھا انسان جس میں ضرر تکلیف دہی کا شروع ہی سے مادہ ہی نہیں ہے یوں اپنی طبیعت کے خلاف کام کرتے کرتے چھوڑ دیا ہے۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ میں انتہائی سادہ دل۔ اور سادہ لوح واقع ہوا ہوں۔

آرزوں کی ناکامی۔ اور خواہشات کی پامالی سے میں خوش ہوتا ہوں اور اس سے میں محبت بھی کرتا ہوں۔ ایک نوجوان لڑکی جو اپنی چچی کے ساتھ رہتی تھی جس کا نصیبہ خوش آیند اور جس کی مالی حالت قابل اطمینان تھی۔ اس نے اپنی دوستی کی خوش قسمتی مجھ کو بھی عطا کی اس سے میں جس اصول سے ملتا تھا وہ قابل تصور ضرور تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی چچی کے عجیب عجیب ملاقاتیوں پر ہنسا کرتی تھی اور میں بھی ہمیشہ اس کی ہنسی میں شریک رہتا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ ایک عقلمند عورت ایک نہایت اچھا شوہر تلاش کر سکتی ہے اور ایک سمجھدار انسان بجائے۔ بے وقوف بننے کے اپنے آپ کو ایک اچھا شوہر ثابت کر سکتا ہے۔ اس کلیہ سے میں اپنے آپ کو بالکل قریب پاتا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ۔ میرے دوستوں کے ساتھ۔ اور ہر قسم کی ذہنی عمرانی اور جمالی گفتگو میں حصہ لیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ مسٹر "شرمپ" کا بھی ذکر کرتی۔ یہ کمبخت میرا رقیب تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے حسن و وقار

اور اونچی ایڑی کے جوتہ پر ناز کرتی۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں میں ر
اتحاد مضبوط ہوتا گیا۔ آخر کار ارادہ کرتے کرتے اور سوچتے سوچتے م
نے اُس بُتِ غارتگرے عقل وہوش سے کہہ دیا۔ بیگم۔ دیکھو ذرا ٹھ
دل سے میری باتوں پر غور کرو۔ جبکہ وہ پنکھا اپنے ہاتھ میں لے
ہوے تھی۔ اور اُس پنکھے پر کی تصاویر کو غور سے دیکھ رہی تھ
آخر کار میں نے کہا۔ پاشا۔ ہماری تمہاری دونوں کی خوشی میں صر
ایک خطرہ حایل تھا۔ سو وہ اب دفع ہو گیا۔ یعنی "مسٹر شرمپ"
شادی کر کے تین ماہ کا عرصہ ہوتا ہے۔ اور اب تم اُس کی بیوی بن
چکی ہو۔ مجھے محبت میں ناکامی ہوئی لہذا تلقین صبر کے طور پر میر
وہ وعدے وعید جو تمہاری بچی سے چل رہے ہیں۔ شاید اب اُس میں
بھی گرمجوشی پیدا ہو جائے۔ اس لئے کہ وہ بڑھیا ہمیشہ مجھے اپنے گھر آ
دیتی ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ میں بالکل بے ضرر انسان ہوں۔ اور مجھ
شمہ برابر بھی ایذا رسانی کا مادہ نہیں ہے۔

اس طریقہ سے میرے ایک دو نہیں بلکہ متعدد دوست ہیں ا
میں ہی ایک ایسا ہوں جو سب کا جواب دیتا رہتا ہوں۔ دوستی۔ اے
دوستی۔ تو انسانی سینوں کو اپنی محبت سے گرما دیتی ہے۔ اور انسان تج
سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ صرف تیرے ہی مدد سے ہم بڑے بڑے دش
کام انجام دے لیتے ہیں۔ اور مشکلوں میں اپنے آپ کو پھنسا دیتے ہیں
تو وہی ہے جس سے بدمعاش جعلساز لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ا

اور تیری مدد سے اپنے منصوبوں کو پورا کر لیتے ہیں۔ غمگین انسان تجھ ہی سے مرہم خوشی حاصل کرتے ہیں۔ تیرے ہی مدد سے غمگسار اور بے سہارا انسان سہارا پاتے ہیں۔ اور پھر نا اُمیدیوں کا خیال بھی نہیں کرتے۔ سب سے پہلے میں نے ایک درخواست شہر کے ایک مشہور سیٹھ سے کی۔ جو رقم کے لین دین کا کام کیا کرتا تھا۔ اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ فی الحقیقت ان کو رقم کی حاجت نہیں ہے تو وہ زبردستی اصرار کرتا تھا کہ رقم قرض لی جائے اور دینے پر بالکل آمادہ تھا۔ ایک دن میں نے کہا میں تمہاری دوستی کی آزمائش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اُس وقت چند سو روپیوں کی ضرورت ہے۔ کیا آپ مجھے قرض دے سکتے ہیں۔ اُس نے کہا جناب کیا آپ کو بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا۔ نہیں جناب بہت زیادہ کی نہیں۔ تب اُس نے کہا دوست مجھے معاف کرنا۔ ہر وہ شخص پہلے پہل جب اُس کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو وہ قرض لے لیتا ہے۔ اور پھر جب وہ ادا کرنے کے لئے آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی ضرورت ساتھ ہی لے کر آتے ہیں اور پھر اصرار کرتے ہیں کہ اتنا قرض اور دو۔ لہٰذا یہ لینے دینے کا سلسلہ ہی بیکار اور فضول چیز ہے۔

اس کے اس ترش روئی کے جواب کے بعد میں اپنے اُس دوست کے پاس پہونچا جو مجھے بہت عزیز تھا اور وہ بھی مجھے کافی محبت کرتا تھا۔ اُس سے بھی میں نے یہی درخواست کی۔ اس پر میرے دوست نے

کہا "مسٹر ڈرائی بون" آپ پر مجھے تعجب معلوم ہو رہا ہے۔ کہ اب آپکا ایسا پوزیشن ہوگیا ہے کہ آپ قرض مانگنے کے لئے نکلے ہیں۔ جناب معاف کیجئے۔ لیکن میں محض آپ کی بہتری کے لئے یہ کہتا ہوں۔ کہ آپ کا چال وچلن اس عہدے پر پہونچ کر قابل اطمینان نہیں رہا ہے۔ اور آپ کے چند احباب ایسے بھی ہیں جو آپ کو ہمیشہ چالباز۔ دغا باز۔ بٹہ باز۔ اور اور جعلساز خیال کرتے ہیں۔ ہاں تو یہ بتلائیے کہ آپ کو دوسو پونڈ کی ضرورت ہے۔ اچھا تو کیا صرف دوسو پونڈ کی۔ میں نے کہا ہاں "ڈیر" صرف دوسو پونڈ کی۔ لیکن اگر سچ پوچھتے ہو تو مجھے تین سو پونڈ کی حتمی ضرورت ہے۔ لیکن ایک میرا اور دوست ہے۔ اس سے میں ایک سو پونڈ لے لونگا۔ کیوں۔ کیوں۔ ایسا کیوں۔ میرے دوست نے کہا اگر آپ میری قیمتی رائے لینا چاہتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ آپ کے فائدے ہی کی سوچا کیا کرتا ہوں۔ آپ کہنا مانئے اور جس قدر رقم کی ضرورت آپ کو لاحق ہو رہی ہے وہ سب کی سب آپ اُسی دوست سے حاصل کر لیجئے۔ اور ان تمام کے لئے صرف ایک پُرزہ نوٹ کافی ہو جائیگا۔

اب مفلسی کی بارش مجھ پر تیز تیز ہونے لگی۔ اس مصیبت میں بجائے اس کے کہ میں بہت زیادہ سمجھدار اور چالاک ہو جاتا۔ مجھ میں آرام طلبی کاہلی۔ اور لاپرواہی دن بدن ترقی پذیر ہوتی گئی۔ میرا ایک عزیز دوست جو پچاس پونڈ کے قرضے کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مجھے

افسوس ہے کہ میں اُس کا ضامن بھی نہ بن سکا اور نہ اُس کو ضمانت پر
رہا کرا سکا۔ لیکن اُس کے بدلے میں۔ میں نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا۔ اور
اُس کو آزادی دلا دی۔ جیل میں میرا خیال تھا کہ مجھے بہت زیادہ اور
کامل اطمینان قلب نصیب ہوگا۔ امن چین سے زندگی گذریگی۔ نئے نئے
آدمیوں سے سابقہ پڑے گا۔ اور اس نئی دنیا کے آدمیوں سے جان
پہچان ہوگی۔ میں یہی خیال کر رہا تھا کہ جیسا میں سیدھا سادا ہوں۔
ویسے ہی اس دنیا کے بھی آدمی ہونگے۔ لیکن اس جیل کی دنیا کے لوگوں
کو میں نے انتہائی مکار۔ بدمعاش۔ اور جعلساز پایا جیسا کہ میں اپنی پچھلی
دنیا کے لوگوں کو چھوڑ آیا تھا۔ میرے پاس جو کچھ بچی کچھی رقم تھی وہ
سب ہضم کر گئے۔ یہاں تک کہ آگ تاپنے کے لئے میرے کوئلے
رکھے تھے وہ سب ان کمبختوں نے جلا لیا۔ اور جب کبھی ہم "کری نج"
کھیلنے بیٹھتے تو یہ ادھر اُدھر سے مجھ ہی کو بے وقوف بناتے اور
دھوکہ دے دیکر مجھ سے ہی رقم وصول کیا کرتے۔ یہ سب کیوں اور
کس لئے کیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ میں عام طور سے مشہور تھا کہ یہ شخص
نہایت سیدھا سادا اور بے ضرر انسان ہے۔ اس میں شمہ برابر بھی ایذا
رسانی کا مادہ نہیں ہے۔

میرے سب سے پہلے اس نا اُمیدی کے محل میں قدم رکھتے ہی
مجھے کچھ نہیں محسوس ہوا۔ ہاں البتہ۔ یہاں پہ بھی وہی تمام ہیجینیاں

موجود تھیں جیسا کہ میں اس سے باہر اٹھا چکا ہوں اور دیکھ چکا ہوں ۔یہاں اور
وہاں کا فرق بھی کس قدر معمولی فرق ہے ۔صرف ۔یہی نہ ۔ایک شخص
دروازے کے اندر ہے اور ایک دروازے کے باہر۔ پہلے پہل مجھے
بڑی بے چینی محسوس ہوئی کہ دیکھو ۔یہاں جیل میں کیسے دن کٹتے ہیں
لیکن جوں جوں ہفتے گذرتے گئے اور میں خوب کھاتا پیتا گیا۔اس وقت
مجھے کچھ بھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی بلکہ ہر طرح سے اطمینان تھا کہ خوب
پکی پکائی مل رہی ہے ۔میں ہر وقت خوش اور بشاش اور ہر کھانے کو
ہنسی خوشی سے کھاتا تھا ۔غصہ کو کبھی اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتا تھا ۔اور کبھی
آسمان سے اپنا رونا نہیں رویا کہ اے اونچے آسمان کے چمکتے ستارو
آؤ اور میرے دسترخوان پر سے نصف پنی کی روٹی اور مولی کا ساگ
کھا کر جاؤ ۔میرے اکثر دوست یہ سمجھتے تھے کہ میں مسلا دُکترکاری کو
بھنے ہوئے گوشت کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتا ہوں ۔اور یہ محض
اُن لوگوں کی خوش فہمی تھی ۔میں اپنی زندگی پر قانع تھا ۔میں نے
کبھی یہ نہیں خیال کیا کہ مجھے اچھے سیدہ کی عمدہ روٹی مل رہی ہے
یا بھوسے کی بھوری روٹی کھانے میں آرہی ہے ۔میں ہمیشہ یہی خیال
کرتا تھا کہ جو کچھ اور جس حالت میں مل رہا ہے وہ بہت غنیمت ہے
مجھے اُس وقت مسرت کی ہنسی معلوم ہوتی ہے اور میں خداوند تعالیٰ
کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تمام دنیا میں بیسوں ایسے انسان ہونگے
جو مصیبت اور تکلیف کی زندگی گزار رہے ہونگے ۔اور بقول ایک

لاطینی شاعر "ٹیاک سی ٹس" (TACITUS.) کے جو اکثر میرے مطالعہ میں رہتا ہے۔ کہ "ہر قسم کی سوسائٹی اور قیمتی کتابوں سے حاصل کی جاسکتی ہیں" اور میں کتابوں ہی کو اپنی رفیقہ حیات سمجھتا ہوں۔

قصہ مختصر میں کہاں تک اپنی اس بے بضاعتی اور تہی دامنی پر اشک حسرت بہاتا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جب کبھی میرے قدیم ساتھی مل جاتے ہیں۔ جن کو میں بے وقوف خیال کرتا تھا۔ وہ اب حکومت کی عطا کردہ بڑی بڑی جگہوں پر ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں سادہ لوحوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جس راستہ پر چل رہا تھا وہ میرے لئے نہیں تھا۔ دوسروں کو شمع ہدایت بتانے کے لئے پہلے خود میں روشنی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ میری بے موقع عجلت نے مجھ کو اپنے گھر بار سے چھڑایا لیکن اب مجھ میں معاملہ فہمی۔ تجربات۔ اور بردباری ضرور پیدا ہوگئی ہے۔ ایک ازاد محکمہ میں میں نے اپنی جمع شدہ دولت کو جمع کرنے کی فکر کرنے لگا۔ سب سے زیادہ میں ایک موقع کی اور اپنی اس سخاوت کی ابتک خود تعریف کرونگا۔ اور یہ احساس اس وقت تک باقی رہے گا۔ جب تک کہ میں زندہ رہونگا۔ وہ یہ کہ میں نے اپنے ایک دوست اور وہ بھی قدیم دوست کی سقیم حالت دیکھ کر اس کو نصف کراؤن دینے کی جرءت کی۔ جبکہ وہ رقم کی ضرورت میں بے تحاشہ اور بری طرح سے پھنسا ہوا تھا۔ اور میں خود اس رقم کو ایک دوسری جگہ سے ادھار لیکر آیا تھا لیکن

اُس قدیم بڈھے دوست نے نصف کراون لینے سے انکار کردیا جس کے لئے میں خود اپنے آپ کو تعریف کا مستحق خیال کرتا ہوں۔
تمام دیکھ دکھا کر اب میں نے کفایت شعاری پر کمر باندھی ہے میری حالت بہ نسبت پہلے کے اب بہت بہتر ہے۔ اب میں اکثر اپنے دوستوں کی دعوتیں بھی کیا کرتا ہوں۔ اب میں اس بات کی کوشش کررہا ہوں کہ کنجوسوں کی طرح مجھ میں بھی وہی خصائیل پیدا ہوجائیں اور آہستہ آہستہ میں بھی قابل عزت بنتا جاؤں۔
میرے پڑوسی مجھے اکثر اپنی لڑکیوں کی شادی کے متعلق پوچھا کرتے ہیں۔ اور میں بھی صائب رائے دیتا ہوں کہ خبردار لڑکیوں کو کبھی باہر نہ دیا جائے۔ اب میری دوستی ایک بڑے معزز شخص سے ہے۔ اور اُس کا یہ مقولہ ہے کہ کبھی جمع شدہ پونجی میں سے خرچ مت کرو۔ اگر ایک ہزار پونڈ میں سے "ایک فارد نگ" بھی نکل جائے تو وہ ایک ہزار پونڈ نہیں ہوتے۔ ابھی چند دن ہوئے ہیں کہ مجھے ایک سیٹھ نے دعوت دی اور میں نے کھانے کی میز ہی پر شوربہ کی بُرائی کردی۔ اس وقت مجھ سے شادی کے معاہدے بھی ہو رہے ہیں۔ اور ایک مالدار بیوہ ہتھے چڑھی ہے۔ اور وہ بھی اس خیال سے کہ آج کل روٹی کا بھاؤ بڑھ رہا ہے اور ہم دولتمند سے شادی کرکے مزہ اُڑائینگے۔ جب کبھی کوئی مجھسے غیر متعلق سوالات کرتا ہے۔ جس کو میں جانتا بھی نہیں ہوں۔ لیکن اپنے وقار

کے لحاظ سے میں مُسکرا دیا کرتا ہوں۔ جیسا کہ اکثر امیر وکبیر کیا کرتے ہیں۔ اور ذرا غور بھی کرنے لگتا ہوں گو یا میں سوال مستفسرہ کی کُنہہ تک پہونچ گیا ہوں۔ جب کبھی ایسی مجلس میں جہاں غریبوں کے لئے چندہ دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو سب سے پہلے میں اُٹھکر ان کی حمایت کرتا ہوں اور سب سے پہلے خود میں ہیاٹ لیکر مانگنے لگتا ہوں کہ اس گڑبڑ میں کون جا سکتا ہے کہ میں نے بھی چندہ دیا ہے یا نہیں۔ اور جب کبھی کوئی فقیر بھیک مانگنے میرے پاس آتا ہے تو میں بھی کہتا ہوں کہ دنیا مکاروں اور دھوکہ بازوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں کا ایک فرد یہ بھی ہے۔

الحاصل اب مجھے صحیح عزت اور سچی شہرت حاصل کرنے کا طریقہ معلوم ہو گیا ہے۔ اور وہ بھی غریبوں سے سیکھا گیا ہے۔ کہ کبھی کسی کو کچھ مت دو۔ اس طرح سے تمہارے پاس دینے دلانے کو بہت کچھ ہوگا۔ مطلب یہ کہ اگر خیر خیرات نہ کی جائیگی تو رقم بھی جیسی کی ویسی تجوری میں رکھی رہے گی۔
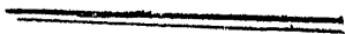
ساتواں خط

مصنفوں کے کلب کا تذکرہ

انگریزوں کی علمی قابلیت کا اندازہ اُن کی روز کی شایع ہونیوالی کتابوں سے ہوسکتا ہے۔ دنیا کا کوئی ملک اور خود چین بھی اس باب میں اُس کی برابری نہیں کرسکتا۔ یہ میرا مشاہدہ ہے اور میں خود گن چکا ہوں کہ روزانہ اُن کے پاس ۲۳ کتابیں نئی شائع ہوتی ہیں۔ مقابلہ کے لئے اگر اُن کی تعداد کا حساب لگایا جائے تو سال بھر میں ۸۳۹۵ کتابیں شایع ہو کر پبلک میں آتی ہیں۔ اور یہ کتابیں کسی خاص مضمون سے تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ بلکہ ہر شعبۂ ادب کی ہوتی ہیں۔ مثلاً تاریخ۔ سیاسیات۔ شاعری۔ ریاضی۔ فلسفۂ اشیاء۔ فلسفۂ قدرت۔ اور یہ سب ایسی سلیس اور اتنی ضخامت میں شایع ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہمارے بچے ابتدائی کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ اگر بالفرض محال ہم یہ خیال بھی کرلیں کہ انگلستان میں عوام کا آٹھواں حصہ بھی اُون شایع ہونے والی کتابوں کو پڑھتا ہے۔ تو اس قلیل حساب سے بھی ہر عالم سال بھر میں ایک ہزار کتابیں پڑھ لیتا ہے۔ اور اس کا بھی یقین ہے کہ اس سے کم کوئی : پڑھتا

ہوگا۔ ان اعداد شمار سے تم اس کا اندازہ کر سکتے ہو کہ ایک ایسے پڑھنے والے شخص میں کس قدر ادبیت ہوگی۔ جو روزانہ تین کتابیں نئی پڑھتا ہو۔ ایسے شخص کی ہر چیز اچھی خواہ وہ تحریر ہو یا تقریر قابل التفات ضرور ہوگی۔ مگر اس کے باوجود یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کتابوں کی تعداد کے حساب سے اُن کے اندر صحیح معنوں میں اتنی بھی قابلیت نہیں ہوتی جو شمار میں آسکے۔ چند ہی ایسے نظر آتے ہیں جو سائنس اور ادب کے ماہر ہیں۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کیا عام کلیہ ہے اور سطحی معلومات شاید ہر شخص میں موجود ہوں۔ یا اُن کتابوں کے مصنفین خود ہی اعلیٰ قابلیت سے معرا ہوں۔ اور یونہی کچھ اُن پر عبور رکھتے ہوں۔ اپنے یہاں چین میں تو یہ ہوتا ہے کہ خود شہنشاہ عالموں اور ڈاکٹروں کو مصنفین بننے کی اجازت مرحمت کرتا ہے۔ لیکن یہاں انگلستان میں ہر شخص کو مصنف بننے کا حق دیا ہے۔ اور قانون کی رو سے اُن کو بالکلیہ اجازت دیدی گئی ہے کہ ہر وہ شخص جو دوسروں کے خوش کرنے کے لئے خواہ کسی قسم کی کوئی کتاب لکھے وہ مصنف بن سکتا ہے۔ اور اُس کو کامل آزادی دی جاتی ہے۔ یہ اُن مصنفین کے مذاق پر مبنی ہے کہ آیا وہ کوئی ایسی کتاب لکھیں جس میں دلچسپی کا عنصر چاہے موجود ہو یا نہ ہو۔ کل میں نے اپنے دوست سیاہ پوش سے اپنا تعجب ظاہر کیا۔ اور وہ اُس مقام کو بتلایا جہاں مصنفوں کا مجمع رہتا ہے۔ جہاں سب لوگ اپنی اپنی

کتابیں طبع کرانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور روزانہ مطبعوں میں یہی
بھیڑ نظر آتی ہے۔ پہلے میرا خیال ہوا کہ لائق اور عالم فاضل لوگ اس
طرح سے اہل دنیا کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اور بھٹکے ہوئے لوگوں
کو سیدھی راہ بتلانا چاہتے ہیں۔ اس خیال کو پورا کرنے کے لئے میرے
ساتھی نے کہا اجی جناب آپ غلطی پر ہیں۔ کالج کے ڈاکٹر اور بڑے
بڑے لوگ کبھی ایسی غلطی نہیں کرتے۔ لکھنا تو درکنار بعض تو آپ
کو ایسے نظر آئیں گے جو پڑھنا بھی بھول چکے ہیں۔ اگر آپ کو ایسے
لایق مصنفین سے ملنے کی آرزو ہے تو آج شام میں آپ میرے
ساتھ چلئے۔ میں آپ کو مصنفوں کے کلب میں لے چلتا ہوں۔ جہاں
آپ سے بیسوں مصنفین سے شناسائی ہوجائیگی۔

اس کلب میں ہر ہفتہ کو بہت سے مصنفین کا اجتماع ہوتا ہے۔
وہ بھی شام کے (۷) بجے اور اس کلب کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ
"دی بروم" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کلب "اسلنگٹن" کے قریب
واقع ہے۔ یہاں پر ہر فرسودہ اور تازہ مضامین پر بحثیں ہوا کرتی
ہیں۔ میرے ساتھی کے کہنے پر مجھ میں بھی اشتیاق اور دوچند ہوگیا۔
اور میں نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ ہم لوگ دونوں ساتھ ساتھ
روانہ ہوئے۔ اور ممبروں کے جمع ہونے سے قبل ہی ہم کلب گھر میں
داخل ہوگئے۔ میرے دوست نے اس کلب گھر کی سب سے بڑی اہم
شخصیت کا مجھ کو اتا پتا بتلایا۔ اس کی حیثیت مہمانوں کی طرح نہ تھی۔

بلکہ وہ خود مصنفانہ وقار رکھتا تھا۔ لیکن ایک کتب فروش کے بہکائے ہیے اور اُس کی پچھلی لیاقت پر نظر کرتے ہوئے اُس کو اس کلب گھر کا صدر بنا دیا گیا تھا۔ اس نے کہا سب سے پہلا شخص ہماری اس کلب کا ڈاکٹر "دونا ن ٹی" ہے۔ یہ ایک نیم حکیم خطرۂ جان ہے۔ اس کے متعلق بہت سے لوگوں کو غلط فہمی بھی ہے۔ کہ وہ زبردست جید عالم ہے۔ لیکن جب کبھی وہ کہنے کے لئے اپنا منہ کھولتا ہے تو ہمیشہ واہی تباہی بک ڈالتا ہے۔ مجھ کو اس کے خیالات اس کے طرز کلام سے موافقت نہیں ہے۔ آگ کے سامنے وہ اپنے آپ کو بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ تمباکو خوب پیتا ہے۔ شراب کے خم کے خم لنڈھا دیتا ہے۔ ہاں البتہ باتیں کم کرتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اچھی صحبت سے احتراز کرتا ہے۔ میرے ساتھی نے کہا کہ وہ ہر کتاب کا اشارہ لکھنے میں خاص قابلیت رکھتا ہے۔ وہ ہر قسم کی برائیوں پر اچھے مضامین لکھ لیتا ہے۔ فلسفیانہ مسائل کے استفسارات پر خواہ وہ کسی قسم کے ہوں وہ ۲۴ گھنٹہ کے اندر ان کا جواب اور اعتراضی کتابوں کا رد جواب لکھ سکتا ہے۔ یہاں اس مجمع میں وہ بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اُس کی لمبی لمبی بھوری بالوں کی ٹوپی اُسکی خاص پہچان ہے اور اس کے علاوہ نیلے رنگ کی دستی ہمیشہ گلے میں بندھی رہتی ہے

دوسرا شخص جو لیاقت اور قابلیت میں فرد ہے وہ "نیم بلیٹ" ہے یہ ایک ظریف الطبع شخص ہے۔ کبھی تو وہ اپنی شان و شوکت لیاقت کا درخشندہ ستارہ نظر آتا ہے۔ اور اس کے ہم عمر ساتھی اس پر رشک کرتے ہیں۔ دوسرے اس کے مزاحیہ لطیفہ عمدہ گانے پریشان کن معمولی

اور اُس کا "تایپیکل" کتاب میں نظمیں پڑھنا۔ جو اُس کا ہی حق سمجھا جاتا
ہے۔ اس کے بوسیدہ کپڑوں اور کثیف لباس سے دوری سے ہر شخص
اُس کو دیکھ کر پہچان لیتا ہے۔ اُس کی گرد آلود بالوں کی ٹوپی غلیظ
اور گندی قمیص پھٹے ہوئے رسّی پاتابہ یہ اس مصنف کا لباس ہے۔
اس کے بعد کا "فریسٹر سیب" کا تھا۔ یہ شخص بہت مصروف اور
کاروباری آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ دیو استے کتے
ان چیزوں کو کتابیں اُن کے لئے ہر سید لکھتے بلکہ اور یا کوئی مشرقی
تماشہ قصہ کو اپنے طرف سے تکمیل کریں۔ یہ شخص مصنفی کے ہتھکنڈوں
سے کافی واقف تھا۔ اور کوئی کتب فروش اس کو دھوکہ نہیں دے سکتا
تھا۔ اس کی خاص پہچان یہ تھی کہ وہ بہت لاپروا واقع ہوا تھا۔ اس کا
کوٹ میلا اور اس پر ہزاروں شکنیں اور سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ
کوٹ اگرچہ پہننے کے لائق نہیں ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنے دوست احباب
سے اس کوٹ کے متعلق یہی کہتا تھا کہ ہم اس کوٹ کو کیوں نہ پہنیں
جب کہ یاروں نے اس کے پیسے ادا کئے ہیں۔

اس سوسائٹی کے مشیر قانونی مسٹر "اسکوئینٹ" نہایت سنجیدہ
اور سیاست داں ممبر سمجھے جاتے تھے۔ یہ صاحب پارلیمنٹ کے لئے
تقریریں ترتیب دیتے تھے اور اپنے دوست احباب کے دواعی
خطابات بڑے بڑے امراء کو خطوط لکھتے۔ تماشوں کے خلاصہ اور
ڈراموں کی تاریخیں بھی لکھا کرتے تھے۔ یہ صاحب ہر موقع پر قابل

نہم خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ میرے ساتھی نے ان لوگوں کے متعلق
ابھی اور کچھ واقعات بیان کرنے ہی کو تھا کہ ایک مہمان جو کہ شاید اس کلب
کا ممبر تھا۔ ایک طرف سے گھبرایا ہوا پریشان اور خوف سے آنکھیں
پھٹی ہوئیں دوڑتا ہوا اس کمرے میں آگیا۔ میرے دریافت پر اس نے
کہا دوستو جناب یا ہر سپرٹ آگیا ہے۔ اس پر میرے ساتھی نے کہا کہ
پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے وہ اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے شبہ
ہے کہ آج کی رات مجلس گرم تر ہوگی۔ اس حقیقت کی تشریح [illegible]
پہنچ میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ اور ہم لوگ [illegible] ہو کر گھر لوٹنے پر تھے
تو اس کو وہیں چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنے [illegible] واقعات پر نظرثانی
کرے۔ جس سے کہ اس کا کردار بالکل نمایاں تھا۔ اور چونکہ مجھے اپنے
دن بھر کے واقعات قلمبند کرکے اپنے دوست کو بھیجنا تھے اس لئے
میں وہاں سے جلد روانہ ہو گیا۔ اچھا خدا حافظ۔

آٹھواں خط

مصنفوں کے کلب کا مزید تذکرہ

ماسکو سے جو مجھے آخری اطلاع ملی ہے۔ اُس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ کاروان
نے ابھی چین کی طرف کوچ نہیں کیا ہے۔ میں تاحال خطوط کے لکھنے میں مصروف
ہوں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ تم کو میرے تمام خطوط اکیدم مل جائینگے۔ اُن
خطوط میں تم کو ایک خط ایسا بھی ملے گا۔ جس میں انگریزوں کی عجوبہ روزگار
چیزوں کی کچھ تشریح ہو گی۔ جس میں اور کچھ اُن کے عادات و اطوار کی
کوئی تصویر نہ ہو گی۔ انسان کے لئے اس سے بڑھکر اور کیا خوش قسمتی
ہوگی اور وہ بھی خصوصاً اُس ایک تنہا مسافر کے لئے جو تمام پر اعتراض
کرنے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھا ہو۔ وہ ہم کو ایسے موقع میں گھسیٹ
لے جاتا ہے۔ جس سے کہ اُس کی رائے بھی متاثر ہو جاتی ہے۔ کسی ملک
کی ذہنی عمرانی حالت دریافت کرنے کے لئے نظر تعمق کی ضرورت ہے۔
اس طریقہ سے ہم کو غیر ملکیوں کے عادات و اطوار کا پتہ لگ جاتا ہے۔
اور اپنے آپ کو وہ اُس وقت ایک اجنبی خیال کرتے ہیں۔ جبکہ کسی
چیز کے متعلق وہ ایک غلط اندازہ لگا لیتے ہیں۔ میں اور میرے دوست
کے درمیان اکثر مصنفوں کے کلب کا تذکرہ ہوا کرتا ہے۔ جہاں پر

ہم نے یہ دیکھا تھا کہ تمام مصنفین جمع ہیں اور بحث و مباحثہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

ایک شاعر تو عجیب و غریب قسم کے لباس میں ملبوس تھا جس کے ہاتھ میں کوئی مسودہ دبا تھا۔ اُس کی خواہش یہ تھی کہ مجمع کے تمام حضار اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اس لئے کہ گذشتہ رات میں اُس نے ایک زبردست رزمیہ نظم فکر کی تھی۔ جس کو سنانے کے لئے وہ بے تاب اور بیچین تھا لیکن تمام ممبر اُس کی طرف مطلق خیال نہیں کر رہے تھے۔ حاضرین کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ کیوں ایک شخص کے لئے تمام لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو جائیں اور خواہ مخواہ اُس کی داد دیں۔ اس لئے کہ بعض ان میں ایسے بھی دل چلے تھے جن کی ضخیم کتابوں کو کوئی دیکھنا تو درکنار ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ یہ خیال کر کے سب نے بالاتفاق یہ پاس کیا کہ اس سننے سنانے کے لئے بھی کوئی قانون پاس کر دینا چاہئے۔ اور یہ بہت ہی بُرا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب نظم خود ہی اپنے مال کی تعریف کرے اور لوگوں میں اشتیاق پیدا کرنے کی فکر کرے۔ چنانچہ اُس نے وہاں کی اسمبلی میں یہ سوال پیش کیا۔ قانون کی کتاب کھولی گئی اور معتمد کلب نے اُس کو پڑھنا شروع کیا۔ جہاں پر یہ خاص طور پر لکھا گیا تھا کہ کوئی شاعر۔ مفکر۔ نقاد۔ یا مورخ۔ جو بھی ہو اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ اہل مجمع کو روک کر رکھے اور اپنا اپنا مسودہ سنائے۔ اُس کو چاہئے کہ مسودہ کھولنے سے پیشتر ہی ۲ ہر پنس۔ پہلے یہاں میز پر رکھ دے۔ اور جب وہ پڑھنا شروع

کریگا تو فی گھنٹہ ایک شلنگ چارج کیا جائیگا۔ اور جو کچھ بھی رقم جمع ہو گی وہ سب اُن سننے والوں ممبروں پر برابر تقسیم کر دی جائیگی جو اُن کی توجہ۔ اور ٹھیرنے کی تکلیف کا معاوضہ ہوگا جائیگا۔

پہلے پہلے تو اس قانون سے ہمارے شعر لئے شیریں مقال ہچکچانے لگے۔ کہ آیا جرمانہ دیکر نظم یا غزل سنائی جائے۔ یا یہ طریقہ ہی اُٹھا دیا جائے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ دو اجنبی بھی کمرے میں آئے ہوئے ہیں۔ تب اُن کی شہرت کی محبت اُن کے جیب پر غالب آگئی۔ اور انہوں نے مقررہ رقم فوراً ادا کر دی تاکہ یہ اجنبی مسافر بھی اُن کے کلام سے لطف اندوز ہو سکیں۔

پہلے پہلے شاعر نے مجمع پر ایک نقادانہ نظر ڈالی۔ پھر اُس نظم کا پلاٹ بیان کیا۔ اور بالکل سکوت کے عالم میں نظم پڑھنا شروع کی۔ مگر قبل اس کے ابتدا سے شروع کر دیتا پہلے شاعر معزز نے ایک مقدمہ یوں مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ کہ معزز حاضرین۔ آج کی نظم جو اس وقت میں آپ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسی ویسی معمولی نظم نہیں ہے۔ اور نہ اُس کی حیثیت اُن ردی کاغذوں کی ہے جو کہ پریس سے آئے دن نکلتے رہتے ہیں۔ ان میں سے یہاں کوئی بھی "ٹرِی سس" اور "ڈائیڈس" نہیں ہے۔ اور یہ نظم ایک تاریخی رزمیہ نظم ہے۔ میں آپ حاضرین سے توقع رکھتا ہوں کہ جس جگر کاوی و جوشی اور جس جگر کاوی سے میں نے نظم لکھی ہے۔ ویسی ہی آپ لوگ داد بھی دیں نظم

پہلے شاعر کے دیوان خانہ سے شروع ہوئی۔ اور شاعر نے بستر پر ہی لیٹے لیٹے جنگ کا سامان باندھ لیا۔ پھر اُس نے کہا حاضرین نظم کا ہیرو میں نے خود اپنے آپ کو تجویز کیا ہے۔ اور یہ جنگ میدان جنگ میں نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ میرے سونے کے کمرے میں ہوئی ہے۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو ایک زبردست عالم اور مقرر سمجھا اور اس انداز میں نظم پڑھنے لگا کہ گویا وہ انتہائی فصیح و بلیغ مقرر ہے۔ پہلے دھمکڑ شاعر کی نظم ملاحظہ ہو۔

"وہ دیکھو "ریڈ لائٹ" ہوٹل دور سے کس قدر چمکتی ہوئی نظر آرہی ہے
وہ ہر اُس راہرو کی خاطر مدارات کرتی ہے جو کہ اُس کی جیب گرم
کرتا ہے ....
جہاں پر "کال ورتھ ہیٹ" اور "پارسن" کی ارغوانی شراب
چھلکتی نظر آتی ہے ....
جہاں پر "ڈنگل" جیسی نازنین طوائف اور "ڈرروری لین" تھیٹر
کی خوبصورت عورتیں نظر آتی ہیں ....
وہاں پر ایک ایسا کمرہ بھی ہے۔ جہاں بیلف کا کوئی خوف و
خطر نہیں ہوتا ....
موسیقی کی دیوی نے "اسکروگن" جیسے شاعر کو پسند کیا جو کہ
پیر پھیلائے کمبل میں سوتا تھا ....
وہاں پر ایک کمرہ تھا اور اُس میں ایک کھڑکی تھی اس میں
سے دھوپ نہ آنے کے لئے کاغذ لگایا گیا تھا ....

وہ یہ ظاہر کرتی تھی کہ ابھی سویرا نہیں ہوا ہے۔ اور وہ ایسی
فضا میں سوتا تھا۔ . . . .
فرش وہاں کا ریتیلا تھا اور مختلف معمولی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔
دیوار کچی اور نم تھی۔ . . . .
شاہی "گوز" کا کھیل بہت زوروں پر چل رہا تھا۔ . . . .
اور یارہ شہیدی احکام کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ . . . . .
اور سوتی کپڑا خاص طور پر پسند کیا جاتا تھا۔ . . . .
اور بہادر شہزادہ "ولیم" لیمپ کی چمکدار روشنی میں اپنا
کالا چہرہ بتلا رہا تھا۔ . . . .
صبح بہت سرد تھی۔ اور وہ اپنی ارزوں کو لٹکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔
آگ کی زنگ آلود انگیٹھی اپنی گرمی سے ہیچ تھی ......
دودھ اور شراب آگ کے اُس حصہ سے بالکل بے نیاز تھے
اور پانچ ٹوٹی ہوئی پیالیاں دھوئیں کی چمنی کیلئے موزوں تھیں
اور رات میں اوڑھنے والی ٹوپی بھوؤں تک ڈھک آتی
تھی۔ جس کو کہ شاعر کا طرۂ امتیاز خیال کرنا چاہیئے۔ . . .
صرف یہی نہیں بلکہ رات میں تو ٹوپی کا کام دیتا تھا اور دن میں
پیروں میں پہنا جاتا تھا۔"
اس آخری شعر پر شاعر وجد کرنے لگا۔ وہ اُس کو اس قدر پسند
تھا کہ بار بار اس کو دُھرا رہا تھا۔ پھر اُس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر

کہا جناب یہ تفصیل آپ لوگوں کے لئے بھی ہے۔ ایک فرانسیسی ڈرامہ نویس
"ایبیاس" کے "دیوان خانہ" کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔
اہا۔ اہا۔

"رات ہیں تو ٹوپی اور دن بھر پائتابے"

اجی حضور اس معمولی سے شعر میں جدت خیال مضمون آفرینی
سلاست۔ اور شستگی بیان کے دریا بہا ڈالیں ہیں۔ حالانکہ ذاتی
حیثیت صرف دس لفظوں سے زیادہ نہیں ہے۔
وہ اپنی شعر گوئی سے بالکل بے خود ہو گیا تھا اور مجمع پر بھی خوش فہمی کی
نظر ڈال رہا تھا۔ جو اپنی ہر ادا سے زبان سے۔ اشارے سے۔ ہنسی
سے۔ رائے سے۔ بلکہ ان تمام سے اظہار تنفر کر رہے تھے۔
لیکن شاعر صاحب ہر شعر پہ اپنی تعریف کی خاطر نظر دوڑاتے اور یہ توقع
کرتے کہ ہر شخص اُن کی تعریف کرے۔ ایک نے کہا بالکل کڑوا بد مزہ
مذاق شاعری ہے۔ دوسرے نے کہا اجی ہٹاؤ کونسی نئی بات کہہ رہا ہے۔
لیکن تیسرے نے مذاق ہی سے کہا بہت خوب ماشاء اللہ "گراسی
مونو" (یہ اطالوی زبان کا کلمہ تحسین ہے) آخر کار جناب صدر کو مخاطب
ہو کر سب نے کہا کہ کیوں "مسٹر اسکو ینٹ" اس نظم کے متعلق آپ کی
کیا رائے ہے۔
میری۔ یہ کہکر جناب صدر نے مسودہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
جناب یہ شراب کا گلاس جو میرے سامنے رکھا ہے اس کے گھونٹ

لیکن کتب فروش کو اس لین دین سے نقصان ضرور ہوا۔ پہلے پہلے یہ واقعہ مجھکو بہت فائدہ مند ثابت ہوئے اور اُن سے میں نے خوب روپیہ کمایا لیکن اب افسوس اور عقلمندی کی حدود سے ہم بہت پار ہیں۔ اگر اتفاقیہ طور پر اس موسم میں کچھ فائدہ نہ ہوا۔ تو یہ جدید کا بیڑہ پھر اپنا طرز و طریقہ بدل دیگی۔ اور اب میں اپنا پُرانا طریقہ وہی تصنیف و تالیف کا شروع کر دیتا ہوں۔ نوکری کی مجھے خواہش نہیں ہے۔

کلب کے جملہ ممبران موسم اور وقت کی شکایت کرنے لگے کہ اس سے بُرا وقت کبھی نہیں آیا۔ ایک معزز آدمی خاص طور پر یہ خیال کرتا ہے کہ شرافت کا معیار اس وقت تک اعلیٰ نہیں ہو سکتا جبتک کہ کمترین سے کمترین چیزوں کی سرپرستی نہ کی جائے اور یہ مجھے معلوم نہیں ہوا کہ یہ واقع کیسے ہوا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہفتہ بھر میں کبھی کوئی چندہ نصیب نہیں ہوا۔ بڑے بڑے امراؤں کے مکانات میں تو کوئی جا بھی نہیں سکتا۔ اس کی مثال تو سرحدی گوداموں کی ہے جو رات میں کُھلتا ہو۔ میں نے کبھی دو ہفتہ کا دروازہ ادھا بھی کُھلے ہوئے نہیں دیکھا۔ جہاں پر دربان یا اور کوئی شخص پورے کپڑوں میں بھی نظر نہیں آتا۔ ابھی کل میں "لارڈ اسکوش" کے مکان پر چندے کی فراہمی کے واسطے گیا۔ جو کہ ویسٹ انڈیز میں پیدا ہوا ہے۔ میں صبح سے شام تک اسکے گھر پر کھڑا رہا۔ اور جوں ہی وہ گاڑی میں بیٹھنے کے لئے آگے بڑھا۔ میں نے اپنی درخواست کو طے کر کے اس کے

ہاتھ میں دیدی۔ اُس نے سب سے پہلے چندے پر نظر ڈالی۔ اور بجائے اُس کے کہ مصنّف کا نام معلوم کرتا چھلکے سے اپنے چوبدار کے ہاتھ میں بلا دیکھے کے واپس کر دیا۔ اُس نے ابھی اپنے مالک کی طرح سرد مہری اختیار کی اور درخواست کو ایک کھڑے ہوے مزدور کے حوالہ کر دی۔ مزدور نے درخواست لیکر مُنہہ بنایا اور میرے خط کو شروع سے آخر تک دیکھنے لگا۔ اور پھر میرے ہاتھ میں غصہ سے دیدیا۔ یہ درخواست جیسی بندھی ویسی کی ویسی میرے ہاتھ میں واپس آگئی۔

"اجی شرافت کو میں شیطان کے حوالہ کرتا ہوں۔" یہ الفاظ ایک غریب آدمی کے مُنہ سے نکلے۔ اور پھر اُس نے اسی بات پر زور دیا کہ اس سے کبھی ذاتی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ابھی چند دن کا ذکر ہے کہ ایک مالدار نواب اپنے سفر سے واپس آیا۔ میں نے اُس کی آمد پر فکر کرنی شروع کی اور ایک نہایت بہترین قصیدہ غرّہ کہکر گذرانا۔ اُس کے لکھنے میں میں نے اس قدر محنت کی تھی کہ گویا میں نے چوہیا سے دودھ حاصل کیا ہے۔ اُس میں اُس کے حسن واخلاق اور اُس کے سفر کے مقاصد۔ فرانس۔ اٹلی اور اُس کی کارگذاری پر تعریف کی تھی۔ میرا خیال ہوا کہ اب میرے واسطے وہ بنک کا چک ضرور لکھے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے قصیدے کو چکدار پنی میں لپیٹ کر ایک ملازم کو ہاف کراؤن رشوت دے کر اُس تک پہونچایا۔ میرا خط اُس امیر کبیر تک حفاظت سے پہنچ تو گیا۔

اور میں دروازے کے باہر اپنے خط کے انتظار میں بیٹھا بھی رہا۔ لیکن چار گھنٹے کے بعد ملازم واپس آیا۔ اور اس عرصہ میں میرا شوق و انتظار حالت اُمید و بیم دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ جو جواب لایا۔ اُس کی لمبائی چوڑان میرے خط سے دوگنی تھی۔ میں نے پُرشوق ہاتھوں سے جواب کے خط کو کھولا۔ میرا خیال تھا کہ اُس میں سے بنک کے چیک اور پر امیسری یا کرنسی نوٹ برآمد ہونگے۔ مگر افسوس ہے۔ اُس نے میرے قصیدے کی طرح اور چھپے قصیدے اسی میں ملفوف کر کے روانہ کر دیے۔

ان ممبروں میں سے ایک نے چلا کر کہا۔ یہ دولتمند کسی کام کے نہیں ہوتے۔ اور خصوصاً ہم مصنفوں کے لئے تو بلیف سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جن کے پاس رحم تو چھو نہیں جاتا۔ جناب میں ایک قصہ بیان کروں گا۔ وہ ایسا ہی صحیح ہو گا۔ جیسا کہ مٹی کی چلم بنی ہوئی ہوتی ہے۔ جب سب سے پہلے میری کتاب شائع ہو کر پبلک میں آئی ہے اور اُس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ تب میں نے درزی کو بلا کر ایک سوٹ سینے کا آرڈر دیا۔ میری شہرت آگ کی طرح ہر طرف پھیل رہی تھی۔ لیکن یہاں رقم آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جب سوٹ سل کر آیا تو یہاں سلائی دینے کی مقدرت نہ تھی لہٰذا ہم نے اپنے گھر ہی کو قید خانہ تصور کیا اور اُسی میں بند رہے۔ اور دلچسپ قصہ سُنئے۔ بلیف بھی بڑا سخت جان تھا۔ وہ

روزانہ نئے نئے حیلے بہانوں سے میرے یہاں آتا۔ اور مجھ کو باہر نکالنے کی فکر کرتا۔ ایک دن یہ پیغام لیکر آیا کہ ایک معزز شخص آپ سے بات کرنے کے لئے یہیں قریب کی ہوٹل کے پاس ٹھیرا ہوا ہے۔ پھر یہ کہا گیا کہ تمہاری خالہ نے تم کو بہت ضروری کام کے لئے بلایا ہے۔ اُس نے ہزاروں جتن کئے۔ مگر میں اُس طرف سے اپنے آپ کو بہرا بنا لیا تھا۔ اور میں نے بھی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ گھر سے باہر کبھی نہ نکلوں گا۔

اس طرح سے پندرہ دن گذر گئے۔ کہ ایک دن صبح ایک صاحب کے ذریعہ سے میرے پاس "ارل آف ڈوس ڈسے" کا پیام آیا کہ میں نے آپ کی کتاب دیکھ کر یہ اندازہ لگایا ہے کہ آپ بہت لائق آدمی ہیں۔ اور مجھے پڑھکر بھی بہت خوشی ہوئی ہے۔ اور اب میری تمنا ہے کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔ لہٰذا اگر آپ میرے پاس آئیں تو میں اور بھی "پلاش" آپ کو دے سکتا ہوں۔ یہ سنکر میں بہت خوش ہوا۔ اور اسمیں بظاہر کوئی بات ایسی بھی نہ تھی۔ جو دھوکہ یا فریب کی ہو۔ اس کے لئے کارڈ جو میرے پاس آیا تھا وہ بھی نہایت خوشنما اور چمکدار تھی والا تھا۔ اور پیام بر بھی نہایت معزز شکل و شمائل کا تھا۔ اب مجھے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا کہ میں بھی کچھ ہوں۔ اب میرے سامنے نہایت خوشنما ہنسی خوشی کا مرغزار تھا۔ میں زمانے کے مذاق کی تعریف کر رہا تھا جس سے کبھی مجھے ایسی توقع نہ تھی۔ چنانچہ میں نے ایک ابتدائی

تقریر بھی اپنے دل میں سوچ لی۔ پانچ نہایت شاندار اور پاکیزہ [illegible]
کے خطابات ذہن میں بنا لئے۔ اور دو اپنے لئے بھی سمجھ لئے کہ [illegible]
سمجھ لئے۔ دوسرے دن صبح مقام [illegible] جیسا کہ [illegible]
اچھی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ میں [illegible] گاڑی کی [illegible]
پر پردہ پڑے رہنا کہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ اور قید خانہ [illegible] جا رہا
میں راستے [illegible] آئندہ توقعات سے سرشار تھا۔ اور اس خیال میں
تھا کہ [illegible] شاندار محل نظر آئے گا۔ لیکن [illegible]
میں [illegible] بڑے محل کے سامنے جا کر نہیں ٹھہری
بلکہ ایک گلی کے [illegible] کے دروازے پر نہیں بلکہ گلی
کے دروازے پر [illegible] گاڑی کو جیل [illegible] کی
طرف بھگا رہا تھا۔ اور میرے خیر مقدم کے لئے جو شخص میرے سامنے
آیا وہ سپاہی تھا۔ جو مجھے گرفتار کرنے کے لئے آیا تھا۔

یہ واقعات ایک مسافر کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتے وہ
انسانوں میں سے ہر چیز کو اپنے لئے باعث رحمت و تربیت کے
سمجھ لیتا ہے۔ اور یہ خصوصیات ہر جگہ اور ہر قبیلے میں پائی جاتی ہیں۔
لہذا مجھے معاف کرنا میں جو کچھ واقعات تم کو چین لکھ کر
بھیج رہا ہوں۔ یہ یہاں کے موجودہ تہذیب و تمدن کے آثار ہیں۔
اور یہ واقعات ایسے ہیں جن سے عوام کے چال و چلن ملازم پیشہ
لوگوں کی طرز و رہائش۔ وزیر اور عمال سرکاری۔ آپس کی اور

سرکاری خط و کتابت۔ ایلچیوں سے گفتگو۔ بہر کیف ان سے سب کچھ مترشح ہوتا ہے۔ اچھا خدا حافظ :۔

نواں خط

ایک کنفیوشس کی چینی سے ملاقات

لین چی لٹنگی نے ہوم کو ایک خط لکھا ہے جو کہ سن یت سین کے واقعہ چین کا پہلا صدر تھا۔

ابھی کل میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ اور میرے سامنے چائے کی پیالی رکھی تھی۔ کہ میری توجہ ایک اور طرف منعطف ہو گئی یعنی میرا قدیم دوست میرے پاس آتے ہوئے نظر آیا۔ میرے دوست نے ایک اور اجنبی سے میرا تعارف کرایا۔ جو اپنی حیثیت کے مطابق مناسب کپڑے پہنے ہوا تھا۔ اس غیر متوقع آمد پر میرے معزز دوست نے مجھ سے بے حد معافی چاہی اور وہ یہ ظاہر کرنے لگا کہ بوجہ خلوص و محبت کے میں بلا کسی کے بلائے

کے حاضر ہوا ہوں ۔ اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس پر متعجب نہ ہونگے ۔

مجھے اپنے ساتھیوں پر شبہ ہونے لگتا ہے ۔ جبکہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ نہایت شریف اور متین بنے ہوئے ہیں ۔ پہلے پہل میں اجنبیوں کے سوالات کا جواب نہایت مختصر دیتا ہوں لیکن چونکہ میرے دوست میرے عادات و اطوار سے بخوبی واقف ہوتے ہیں ۔ اور وہ اُسی گرمجوشی سے ملتے ہیں ۔ تاکہ محبت و یگانگت میں کوئی فرق نہ پڑنے پائے ۔ ایک نے آخر پوچھ ہی بیٹھا کہ کیوں مسٹر "فیج" کیا ابھی تک کوئی تمہاری نئی کتاب پبلک میں نہیں آئی ۔ تب میں نے تاڑ لیا کہ بے شک یہ پوچھنے والا شخص ہو نہ ہو کوئی کتب فروش ہی ہوگا ۔ اور اس کے اس سوال سے مجھے یقین کامل بھی ہو گیا ۔

اُس نے کہا جناب مجھے معاف کیجئے ۔ غالباً ۔ یہ آپ کو نہیں معلوم ہے کہ ہر شئے کا ایک زمانہ ہوتا ہے ۔ اور ان کتابوں کا بھی کھیرے ککڑی کی طرح ایک موسم ہوتا ہے ۔ میں موسم گرما میں کبھی کوئی نئی کتاب پبلک میں نہ لاؤنگا ۔ اور شکار کے موسم میں کبھی گوشت بیچنے کی کوشش نہ کروں گا ۔ اس لئے کہ موسم گرما میں مال کی نکاسی بہت کم ہوتی ہے ۔ اور عام طور پر لوگ چھوٹی چھوٹی کتابوں کا پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ مثلاً کوئی ریویو کوئی تنقید ۔ یا کوئی رسالہ ۔ یا کوئی موسمی نمبر کا رسالہ ۔ یہ چیزیں موسمی پڑھنے والوں کو زیادہ مرغوب ہوتی ہیں ۔ لیکن جو قابل تعریف یا پُر مغز تصانیف ہوتی ہیں ان کو ہم موسم بہار اور موسم سرما کے لئے اٹھا کر رکھ دیتے ہیں ۔

اس پر میں نے کہا کیوں جناب آپ کے نزدیک وہی کتاب قابلِ
تعریف اور پُر مغز ہوتی ہے جو موسم سرما میں پڑھی جاتی ہو۔ اس پر کتب
فروش نے جواب دیا۔ حضور معاف کیجیئے۔ جانے دیجیئے۔ یہ حضرت میرا نقطۂ
نظر یہ نہیں ہے۔ اور نہ اس بارے میں کچھ مبالغہ کرتا ہوں۔ بلکہ ہر کتب
فروش اسی پر عمل کرتا ہے۔ لیکن جناب میرے پاس تو ہمیشہ نیا اسٹاک
رہتا ہے۔ اور جہاں کتابیں بوسیدہ اور پرانی ہوئیں کہ میں نے ردی فروش
بنانے والوں کو ردی کی طرح دے دیتا ہوں تاکہ اُن لوگوں کے کچھ
کام آجائے۔ ابھی میرے پاس دس ٹائیٹل پیج تیار رکھے ہیں۔ اُن کے
لئے صرف کتابوں کی ضرورت ہے۔ جو کہ موجودہ مذاق کے مطابق ہوں
اور جو پبلک میں ایک تہلکہ پیدا کردیں۔ یوں تو بہت سی ایسی کتابیں
ہوتی ہیں جو گرے ہوئے مذاق کے مطابق ہوتی ہیں اور آوارہ گرد انہیں
بہت پسند کرتے ہیں لیکن جناب میرا یہ شیوہ نہیں ہے۔ میں محض پیسے
کے لئے عوام کا مذاق خراب نہیں کرتا۔ میں ہمیشہ آوارہ گردوں کو اس
بات کا موقع دیتا ہوں کہ وہ مجھے کچھ نہ کچھ کہتے رہیں۔ جب کسی چیز کے
متعلق کوئی ہلڑ مچتا ہے تو میں بھی اُن لاکھوں آدمیوں میں مل جاتا
ہوں۔ اور تمام کی گونج بن جاتا ہوں۔ اس معنی کر تو لوگوں کو تو یہ
کہنا چاہئے کہ ایسا تھالی کا بینگن تو ایک بدمعاش ہوگا۔ اس پر میں
نے ایک شخص سے ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ جس کا نام بدمعاش
تجویز کیا گیا۔ یہاں تک کہ ہر شخص اس کتاب کے خریدنے کا شائق نظر

آیا محض اس وجہ سے نہیں کہ اس میں کوئی اعلیٰ اوصاف کی قابل قدر باتیں
ہونگی بلکہ یہ دیکھنے کے لئے کہ دیکھیں اس میں ہمارا عکس کیسا نظر آتا ہے۔
اس پر میں نے کہا۔ جناب آپ تو ایسی باتیں کرتے ہیں گویا آپ ہی
ایسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ کیا میں چند ایسی کتابوں کے نام پوچھنے
کی جرأت کر سکتا ہوں جو اپنی خصوصیات اور وحشت آفریں خیالات
کی وجہ سے دنیا کو انگشت بدنداں کر دیں۔ اس پر باتونی کتب فروش
نے کہا۔ نہیں جناب کتابوں کے پلاٹ میں خود ترتیب دیتا ہوں لیکن
اس کو بڑھا چڑھا کر لکھنے کے لئے میں خود بہت احتیاط برتتا ہوں بلکہ
آپ کی مہربانی سے امید ہے کہ آپ خود اس چیز کو غور کرینگے۔ اسے
دیکھیے جناب یہاں آسمان کے درخشندہ ستارے رکھے ہیں
"اسپریمیس" یہ کتاب بہت سے طبی نسخوں کا ترجمہ ہے۔ یہ ان
لوگوں کے لئے بہت مفید ہے۔ جو لاطینی زبان سے واقف نہیں ہیں۔
"آیتھم" یہ کتاب تو جوان پادریوں کے لئے ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا
ہے کہ اگر کسی موقع پر کوئی ہنسنے کا موقع ہو تو کس قسم کا چہرہ بنایا جائے
جس سے ہنسی بھی واضح ہو جائے اور پھر سنجیدگی بھی باقی رہے۔ اسی
"ایتھم" میں عشق کرنیکے۔ محبت کرنے کے اصول بتلائے گئے ہیں۔ اور
"جینیج ایلی" دلال نے بھی خوب خوب اپنے تجربے بیان کئے ہیں۔ صرف
یہی نہیں بلکہ اس میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ پنسل کس طرح سے
چھیلا جائے۔ اور "رائٹ انریبل ارل آف ـــــ ـــ کے لئے

دانت خلالین کس طرح سے کاٹی جائیں۔ یہی "آیٹم" تمام نامی گرامی رسالوں کا باپ دادا کہلا جا سکتا ہے۔ اس پر میں نے کہا۔ ہاں جناب اب ٹائیٹل پیج کا سب سے پہلے چھپ جانا میری سمجھ میں بخوبی آگیا۔ میں چند لمبے لمبے مسودوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔ جس میں تاریخ ہو۔ یا کوئی لمبی رزمیہ نظم ہو۔ یہ سنکر اُس نے کہا خدا مجھ پر مہربان ہو۔ اچھا آپ جیسا تجارتی آدمی بھی رزمیہ نظم کے پڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔ تو لیجئے اب میں آپ کو ایک بہترین عشقیہ قصہ دکھلاونگا۔ یہ دیکھئے اس میں موجودہ مذاق کے مطابق شروع سے آخر تک مذاق ہی مذاق ہے۔ اجی ہاں جناب اس میں فقرے ہیں۔ روزمرے ہیں۔ طعنے ہیں۔ لٹکے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ عقلمندی اور ذہانت کے چٹکلے بھی ہیں۔ کیا ان خطوط فاصل کو آپ قلمی خامیاں تصور کرینگے یا قصداً مذاق کے ٹکڑے خیال کرینگے۔ اس پر میں نے کہا۔ بس جناب اس کے سوا اور کچھ میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ پھر اُس نے کہا جناب میں باادب آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ آپ ایسی کتاب کو کیا کہینگے۔ کیا آج کل آپ کوئی نئی چیز پبلک میں دیکھ رہے ہیں جس میں کہ خطوط فاصل۔ یا نقطے نہوں۔ اجی حضور ان نقطوں اور خطوط سے تو زور کلام میں اور زیادتی ہو جاتی ہے۔ حضور۔ ایک باموقع خط فاصل تمام لطیفہ کی جان ہوا کرتا ہے اور موجودہ عہد میں تو یہ خطوط نثر کی جان ہوا کرتے ہیں۔ ابھی گذشتہ موسم میں۔ میں نے

ایک شخص سے ایک کتاب خریدی جس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس میں نون سو پچپانوں چھوٹے چھوٹے فقروں کے آگے رکاوٹ کے نقطے تھے۔ ۳۷ جگہ آہا اہا تھا۔ تین اچھی باتیں تھیں اور ایک تمام کی زنجیر تھی۔ یہ کتاب پبلک میں خوب چلی۔ خوب آچکی۔ خوب ناچی۔ اور آتشبازی سے زیادہ پبلک میں ہاتھوں ہاتھ لیگئی میں نے خیال کیا جناب آپ تو اُس سے خوب کمائے ہونگے۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ چھوٹا سا رسالہ خوب پیسے دیا۔ لیکن وہ کتابیں جن پر کہ گذشتہ موسم سرما میں مجھ کو ناز تھا وہ اور ہی چیزیں تھیں۔ میں نے دو قتل کی روئداد سے بہت کمایا لیکن جو کچھ بھی کمایا وہ سب ایک خیراتی فنڈ میں ضائع ہوگیا "ڈایراکٹ روڈ" اور "اسٹیٹ" سے مجھے بہت کم فائدہ ہوا لیکن "انفرنل گائیڈ" نے پھر مجھے نیچے سے اُوپر کردیا۔ لیکن جناب وہ کتاب بھی کیسی تھی ایک نہایت لائق عالم فاضل شخص نے اُس کو شروع سے آخر تک دیکھا تھا۔ اور اس میں ابتدا سے انتہا تک اچھی ہی اچھی باتیں تھیں مصنف نے ہنسی مذاق پر بہت زیادہ زور دیا تھا۔ نتیجہ دلچسپ تھا۔ تنقید بھی ایسی تھی کہ نازک طبایعوں پر گراں گزرنے والی نہیں تھی مصنف نے اس بات کا خیال رکھا کہ نتیجہ اور مذاق دونوں ساتھی ہی ساتھ چلیں تاکہ اصل کتاب پر اس کا کوئی بار نہ ہو۔ اس پر میں نے پوچھا کہ آخر کتاب کس غرض کے لئے شائع کی جاتی ہے۔ کتب فروش نے

لیا۔ جناب فروخت ہونے کے لئے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اصل
کتاب اس قدر زیادہ تعداد میں نہیں بکتی جس قدر کہ تنقید بکتی ہے
ور یہ تنقید کتاب کے شائع ہونے کے ساتھ ہی پبلک میں آجاتی ہے۔
موجودہ عہد میں وہ کتاب جو سب سے زیادہ فروخت ہونے والی ہوتی
ہے۔ میں تنقیدی کتابوں کو تمام پر ترجیح دیتا ہوں۔ اس لئے کہ یہی
کتابیں بہت زیادہ تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔

مجھے خیال ہے کہ ایک مرتبہ میرا سابقہ ایک ایسے مصنف
سے پڑا جس نے اپنی کتاب میں ایک نقطہ بھی ایسا نہیں چھوڑا جو
ناقدوں کے لئے کارآمد ہوتا۔ وہ ہر نقطہ کو نہایت جانچ پرتال
سے لکھتا اور ہمیشہ سلامت روی کی چال سے چلتا کہ تنقید نگاروں کو
کوئی موقع اعتراض کا نہ ملے۔ یہی اس کی خصوصیات کہلائی جا سکتی
ہیں۔ جو اس کا ساتھ دیے ہی تھیں۔ میں نے اس کے اسلوب نگارش
پر نظر ڈالی وہ بھی تنقید کے حدود سے پار تھا۔ چونکہ وہ کسی کام کا نہیں
تھا۔ اس لئے لوگ اس کو قلم دوات اور کاغذ لا لا کر دیا کرتے تھے کہ
وہ دوسروں کی تصانیف پر خوب دل کھول کر اعتراض کیا کرے۔
قصہ مختصر یہ ہے کہ میں اس کو ایک خزانہ سمجھتا ہوں اور کوئی ایسی
اہلیت نہیں ہے جو اس کے یہاں موجود نہ ہو۔ لیکن جو چیز کہ تمام
سے ممتاز ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ لکھتا ہے وہ بہت ہی تلخ ہوتی
ہے۔ اور جب وہ شراب پی کر لکھتا ہے تو اس کا کیا کہنا وہ تو

ہے۔ اور ہر چیز کو آپ کی سادہ لوحی پر محمول کرے گی جو کہ اعتراضات سے زخمی ہوتی رہتی ہے۔

میں نے کہا آپ بالکل سچ کہتے ہیں۔ اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے اور پبلک کو اپنا حامی بنانے کے لئے میں اپنی انتہائی لیاقت و محنت سے کام لونگا۔ اگرچہ کہ میں اتنا لائق نہیں ہوں کہ ہر چیز کا کھلے ڈلے مقابلہ کر سکوں۔ پھر بھی میں اپنی کمزوری کو ظاہر نہ ہونے دونگا اور اپنے آپ کو اتنا بے وقوف بھی ثابت نہیں کرونگا۔ جتنا کہ قدرت نے مجھے بنایا ہے۔ اس پر کتب فروش نے کہا کہ تب تو یہ بڑی خوبی کی چیز ہے۔ ہم تو آپ کو اپنی ہتیلی کا پھوڑا بنا کر رکھینگے۔ چاہے وہ یقینی ہو۔ یا غیر یقینی ارادی ہو یا غیر ارادی۔ یا اخلاق و عادات سے بالکل بعید ہو۔ اور یہ غلطی فائدہ بخش تو ضرور ہوگی۔ پھر تو جناب ہم آپ کو چوہے کی طرح شکار کر سکتے ہیں۔ ابا کی قسم اس کے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں یا تو دروازہ کھلا ہوا ہو یا بند ہو۔ چاہے میں حق پر ہوں یا بے حق۔ فطری ہوں یا غیر فطری۔ لیکن ہم اعتراض ضرور کرینگے۔ کتب فروش نے کہا کہ ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ بالکل بے وقوف بنا کر چھوڑیں۔ اور علی اعلان کے مقابلہ میں اچھی خاصی زک اُٹھانی پڑے۔ لیکن ہاں جناب مجھے معاف کرنا یہ موقع تو معاملہ کا ہے۔ میری ایک کتاب آج کل پریس میں ہے اور زوروں سے اُس کا کام چل رہا ہے۔ کتاب کیا ہے ایک چین کی

تاریخ ہے۔ براہ کرم اگر آپ اتنی تکلیف گوارا کریں کہ آپؒ اپنا
نام دیدیں۔ تو اس پر میں آپ ہی کا نام چھاپ دوں جس کے
لئے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوگا۔ کیا کہا جناب ایسی کتاب
کے لئے آپ میرا نام مانگتے ہیں جس کو میں نے دیکھا بھی نہیں ہے۔
نہیں جناب مجھے معاف کیجئے۔ میں پبلک میں اپنے نام کی شہرت
گنوانا نہیں چاہتا۔ میرے اس سرد مہری کے جواب سے اُس کی
اُمیدوں پر پانی پڑ گیا۔ اور ادھ گھنٹہ تک خواہ مخواہ کی بحثا
بحثی ہوتی رہی۔ آخر کار وہ شکستہ خاطر میرے پاس سے اُٹھکر چلا گیا
اچھا خدا حافظ۔

دسواں حصہ

ایک اہم شخصیت کی عادات و اطوار اور

اُسکی احتیاطیں

(سابق)

اگرچہ فطرۃً میں قنوطی واقع ہوا ہوں لیکن خوش مزاج صحبتوں کا عاشق ہوں۔ اور ہر ایسے موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے میں ہر قسم کے کام کاج چھوڑ کر محظوظ ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی خیال کے تحت میں ہمیشہ خوش مزاج صحبتوں کا مرکز بنا رہتا ہوں۔ اور جہاں کہیں مسرت وراحت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ میں وہاں اُس کے خریدنے کے لئے بلا کسی کے بلائے ہوئے خود ہی سے پہونچ جاتا ہوں۔ آگے چاہے جو کچھ بھی ہو۔ مگر میں تو شریک محفل ضرور ہوتا ہوں۔ میں بالکل اُن لوگوں کے ہم خیال ہو جاتا ہوں۔ جیسا وہ چیختے چلاتے ہیں اور ہر طریقہ سے اُن کی ہمنوائی کرتا ہوں۔ اور جب وہ کسی چیز سے اظہار تنفر کرتے ہیں۔ اس چیز سے میں اُن سے زیادہ بیزاری ظاہر کرتا ہوں۔ ایک دل جو کسی وجہ کی بنا پر ڈوب رہا ہو۔ اور اپنی فطری رفتار سے بھی اس میں کمی واقع ہو جائے۔ دراصل یہ تیز اُڑان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جب کوئی شخص آگے

کودنا چاہتا ہے۔ تو وہ پہلے دور سے دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اور پھر جست
بھرتا ہے۔ جس سے اس کی اڑان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ شاعر کی بہار
سے متاثر ہو کر میں اور میرے دوست نے دونوں نے ہی پبلک پارک
میں بغرض تفریح جانے کا ارادہ کیا۔ جو شہر سے بالکل قریب تھا۔ پارک
میں پہنچنے کے بعد ادھر ادھر ہم بلا ضرورت ٹہلنے لگے۔ پارک میں
بہت سے حسین و جمیل نظر آئے جن کی تعریف نہیں کی جا سکتی
تھی۔ بعض تو صورت کی تعریف کے مستحق تھے۔ اور بعض سیرتوں
کی تعریف کے۔ ہم دونوں یوں ہی ٹہلتے ٹہلتے نکل گئے تھے۔
کہ میرے ساتھی نے میری کہنی پکڑ لی۔ اور کہا کہ جلدی میاں بھاگ کے
چلو پبلک پارک سے باہر نکلیں۔ وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ یہاں تک
کہ میں اس کے قدموں کا بھی ساتھ نہ دے سکا۔ اس اثنا میں وہ گھڑی
گھڑی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ اور ایک شخص ہمیں چوہا سمجھ کے
بلے درماں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اس سے اپنا پیچھا
چھڑانا چاہتا تھا۔ پہلے ہم داہنی طرف مڑے۔ پھر اس کے بعد
بائیں طرف مڑے۔ پھر اس کے بعد بائیں طرف۔ جوں جوں ہم آگے
تیز تیز جا رہے تھے۔ وہ شخص بھی ہمارے برابر آ جانے کی کوشش کر رہا
تھا۔ اور تیز تیز چل رہا تھا۔ ہماری سب کی کشمکش بیکار ثابت
ہو گیا۔ جس شخص سے ہم بچنا چاہتے تھے۔ وہ موقع پر ہمارے ساتھ
اور ہر گھڑی خصوصاً اس باب میں اس کو فتح حاصل ہو چکی تھی۔ آخر

میں ہم تھک کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ اور ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ چلو آج اُس سے دو دو باتیں تو ہو جائیں۔ جس سے ہم بچ نہ سکے۔

ہمارا تعاقب کرنے والا فوراً ہمارے پاس آ گیا۔ اور اس طریقہ سے صاحب سلامت ہوئی کہ گویا ہم ایکدوسرے کے بہت یار غار اور قدیم دوست ہیں۔ اجنبی نے کہا میرے پیارے "ڈارلنگ" یہ کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ ملانا شروع کیا اور یوں گویا ہوا کہ اے میرے سوکھے سہمے دوست آپ تقریباً نصف صدی سے کہاں پوشیدہ ہیں۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ کسی کی زلف میں اُلجھ گئے ہیں۔ اور شہر سے باہر گاؤں میں الفت و محبت کے پینگ بڑھا رہے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا ایسی ہی بات ہے۔ اس جواب کے دینے سے پہلے میں نے اُسکے لباس کا آنکھوں سے جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کی ٹوپی متعدد مقامات سے پھٹی ہوئی تھی۔ اور رنگ بھی غائب ہو چکا تھا۔ خود اس کے چہرے کا رنگ زرد اور اس کا جسم نحیف اور ناقابل التفات تھا۔ اپنے گلے کے گرد حضور نے ایک سیاہ مخملی فیتہ بھی باندھ لیا تھا۔ اور سینہ پر ایک خوشنما شیشہ کا نگینہ بھی لگا ہوا تھا۔ اس کا کوٹ میلا اور شکن آلود تھا۔ کمر سے ایک ٹوٹی پھوٹی تلوار بھی بندھی تھی۔ جس کا قبضہ سیاہ تھا۔ اُس کے لمبے پائتابے اگرچہ کہ وہ دُھلے ہوئے تھے لیکن زیادہ استعمال کی وجہ سے وہ بے رنگ ہو گئے تھے۔ میں اُس کے اس لباس کو دیکھکر اُسی میں محو ہو گیا۔ اور وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس کا مجھے مطلق خیال نہیں رہا۔

ہاں البتہ اُسکے آخری جملے مجھے یوں سنائی دیئے۔ جس میں اُس کے لباس کی خوش مذاقی اور خوبصورتی کا سہرا وہ اپنی بیوی کے سر باندھ رہا تھا۔

اجنبی دوست یہ بتلانا چاہتا تھا کہ اُس کی بیوی نہایت سلیقہ شعار اور خوبصورت عورت ہے۔

تخشی۔ اس نے کہا اجی جناب اس کو چھوڑیئے۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ مجھ سے کریئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خوشامد سے نفرت کرتا ہوں۔ میں اپنے وجود کی قسم کھاتا ہوں۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ مجھے خوشامد ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ باوجود اس کے تمام امیر کبیر لوگ مجھ سے ہر وقت ملنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ اور جس کو دیکھو نئے نئے کھانوں کی دعوتیں دیتا رہتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ اور اُن لوگوں سے پیچھا چھڑانے کی ہزار ہزار کوشش کرتا ہوں۔ مگر یہ ایسے چمٹے رہتے ہیں کہ مجھے کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں دیتے۔ ان میں بعض اچھے اور مہذب لوگ بھی ہیں۔ مگر جناب مجھ سے ایسی بے رخی نہیں برتی جاتی۔ آخر اور لوگ جو زندہ رہنا چاہتے ہیں اور جو آپس میں میل ملاپ بڑھانا چاہتے ہیں۔ اُن کی بھی کوئی خبر گیری کرے گا یا نہیں بعض تو بیچارے اسقدر سیدھے سادھے ہوتے ہیں کہ جیسے میرے معزز دوست "لارڈ مڈلر" ہیں۔ یہ ایسے مقدس آدمی ہیں کہ اُنہوں نے کبھی مرکب شراب کی تیاری کے وقت کبھی اپنے ہاتھ سے اس محلول میں لیمو نچوڑنے کی

کبھی زحمت گوارہ نہیں کی۔ ایسے شخص کا میں خود بھی پرستار ہوں۔ اور لوگ بھی اس کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ابھی گزشتہ کل کا ذکر ہے کہ مجھے بیگم صاحبہ "پکاڈلی" کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ میرے نواب بھی وہیں موجود تھے۔ نواب نے مجھ سے ہنستے ہوئے کہا اجی مرشد کہو تو میں شرط باندھ لوں۔ اور یہ میں دعوی سے کہہ سکتا ہوں اور آپ کو بتلا سکتا ہوں کہ کل رات آپ کہاں تھے۔ میں نے کہا بتلائیے میں کہاں تھا۔ اس نے کہا آپ ہم سے اڑ کر کہاں جائیں گے۔ ابھی قبلہ رات آپ حسن و شباب کی سرپرستی فرمانے کے لئے کہیں گئے تھے۔ یا نہیں۔ میں نے تعجب سے کہا سرپرستی اور حسن و شباب کی میں اور اس عیاشی کے چکر میں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو جوان مست شباب لڑکیوں کی تلاش میں نہیں پھرتا ہوں۔ بلکہ لڑکیاں خود میری تلاش اور جستجو میں رہتی ہیں۔ نواب جب کبھی مجھے کوئی خوبصورت عورت مل جاتی ہے تو اس پر میں اس بری طرح سے گرتا ہوں۔ جیسا کہ اکثر جانور اپنے شکار پر گرتے ہیں۔ میں کچھ نہیں کرتا ہوں بلکہ شکار خود شکاری کے قبضہ میں آنا پسند کرتا ہے۔ اور پھر میں اس کو ہڑپ کر لیتا ہوں۔

اے بدبخت "شب" تو بھی کس قدر بدقسمت آدمی ہے۔ ترحم آمیز نظریں ڈالتے ہوئے میرے ساتھی نے کہا۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کا نصیب بھی اس قدر بلند ہو گا۔ جیسے کہ آپ کے خیالات

ہے۔ دیکھئے اس کا ذکر کسی اور سے مت کیجئے گا۔ اس کو آپ بالکل راز میں رکھئے۔ اور حقیقت میں یہ راز ہے۔ اتفاق سے کھانے کے میز پر ٹرکی (مرغ) بھی تھا۔ اس پر شوربہ اور سرکہ چھڑک چھڑک ہم لوگ کھا رہے تھے۔ مگر اس شوربہ میں ہینگ نہیں ملی تھی میں نے کھاتے ہوئے کہا میں ایک ہزار اشرفیوں کی شرط بدتا ہوں۔ اچھا دیکھیں سب سے پہلے کون کھاتا ہے۔ لیکن پیارے "ڈاری لونا" آپ انتہائی شریف اور ایماندار شخص معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سمجھ کر میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ اس وقت مجھے نصف کراؤن کی سخت ضرورت ہے۔ براہ کرم عنایت فرما کر مجھے ممنون فرمائیے۔ لیکن اس کا خیال رکھئے کہ آپ مجھ سے وصول ضرور کر لیجئے۔ اس لئے کہ میں بھولتا بہت ہوں۔ اور بیں حصہ اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں میں آپ کا قرضہ بھول نہ جاؤں۔ آپ مجھے اس کی بابتہ صرف یاد دلاتے رہئے۔

جب وہ ہم سے جدا ہو گیا تو اُس کے متعلق بہت دیر تک ہم لوگ اظہار خیال کرتے رہے۔ کہ اس قسم کا تعجب خیز شخص جس کا لباس خود کیا کم مضحکہ خیز اور ہنسانے والا تھا۔ کبھی تو آپ اُس کو پھٹے ہوئے چیتھڑوں میں دیکھیںگے۔ اور کبھی آپ اس کو کارچوبی لبادہ پہنا دیکھیں گے جن جن لوگوں کا اور بڑی بڑی شخصیتوں کا یہ اکثر ذکر کیا کرتا ہے۔ اُن سے گہری ملاقات تو ایک بڑی چیز ہے کبھی کی دور سے اور وہ بھی چائے خانہ کی بھی اس سے شناسائی نہیں ہوتی۔ بہر کیف

کچھ تو سوسائٹی کی دلچسپی کے لئے اور کچھ تو اُس کو قدرت نے یوں عجیب الخلقت اور مفلس بنا دیا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام دنیا اس کی آرزوں کو پورا کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ اور یہ خود اہل دنیا سے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس دلچسپ دوست کو اور ہر شخص اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مگر لوگ اُس کی چرب زبانی کے پہلے حصہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور بعد کا حصہ یعنے جیب پر بارڈالنا یہ لوگوں کو نہیں بھاتا۔ اس لئے کہ لسانی کے بعد یہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ وصول کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ جوانی میں یہ اپنی چرب زبانی اور عیاری سے اپنا پیٹ پال لیتا ہے۔ لیکن جب بڑھاپا سلط ہو جاتا ہے اور وہ اپنی وہی چھچھوری اور مضحکہ خیز حرکات سے کام لینا چاہتا ہے۔ جیسا کہ وہ جوانی میں کرتا تھا تو کوئی اس کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ اور آخر میں یہی شخص کسی بڑے گھرانے میں جا کر اُن کے دروازہ پر پڑ جاتا ہے۔ اور وہاں اس کی شخصیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ کہ ملازمین کی جا و بے جا شکایت کرتا رہے۔ اور اپنے آپ کو اُن کے لئے جاسوس بنالے۔ یا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو ڈرانے کے لئے ہوّا کے نام سے یاد کیا جاتا ہو۔

اچھا خدا حافظ۔

گیارھواں خط

تارک الدنیا ہو کر عقلمندی سیکھنا بیوقوفانہ کوشش ہے

لیون چی الینگی ایک خط ہینگپو کو باسکو کے راستہ لکھتا ہے

میرے ۔ پیارے بچے ۔ کتابوں کے مطالعہ سے ہم دوسروں کی عزت کرنا سیکھتے ہیں ۔ اور بعض اوقات ہم خود اس میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ خود ہم کو اپنا خیال نہیں رہتا ۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ نوجوانوں کو اُن کے مذاق کے مطابق ایک لطیف خوشی کا احساس ہوتا ہے جس میں مجموعی طور پر تو رنج و غم پنہاں ہوتے ہیں ۔ لیکن فطری خوشی میں ہر شے حصہ لینے کو تیار رہتی ہے ۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس دنیاوی جلسہ ترنم میں وہ خود بھی برابر کا حصہ دار نظر آتا ہے ۔ لیکن اس انداز سے کہ اپنی ہستی کو بالکلیہ فراموش کر دیا جائے ۔

میں اُن فلسفیوں کو نہایت نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں جو کہ

مصائب دنیوی کو نہایت خوشگوار رنگ میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جن سے قنوطی طبقہ خوش ہو کر ان تکالیف پر ابدی مسرت کا دھوکہ کھا کر مر مٹنے کو تیار نظر آتا ہے۔ اور مفلسی کی تکالیف کو حاصل کرنے کے لئے اپنے دلی اشتیاق کا اظہار کرتا ہے۔ اور جب مفلسی سے ملتے ہیں تو اس طرح ملتے ہیں کہ گویا ان کو کسی قسم کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب تک عوام مفلسی کے انتہائی خوگر نہ ہو جائیں یا اس کے شدائد اور سختی کو ایک تماشہ اور ایک مذاق خیال کرتے ہیں۔ اور ان سے ہراساں ہونا تو درکنار اس کو اپنے لئے ایک سرمایہ مسرت خیال کرتے ہیں۔

ایک وہ نوجوان جس نے اپنی تمام عمر مطالعہ کتب میں صرف کر دی ہے۔ اس کے لئے عملی طور پر دنیا ایک عجوبہ سے کم نہیں ہوتی جہاں دنیاوی عیاروں سے اور ان سے مطلق راہ و رسم نہیں ہوتی لیکن فلسفیانہ معلومات کی بنا پر اس دنیا کو بھی وہ ایک وجود تسلیم کرتا ہے۔ جس کے دماغ میں عقلمندوں کی ہرزہ سرائیوں کا کافی انبار لگا رہتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس دنیاوی عملی سفر کے لئے ایک کامیاب رہبر کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ وہ شعاع ذہانت و تدبر کو چراغ رہنمائی خیال کرتا ہے۔ وہ شاہراہ خود اعتمادی پر بلا کھٹکے گامزن ہو جاتا ہے۔ اپنے بیجا فخر و غرور کی باعث اس سے خطائیں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ اور مجموعی طور پر آخر کار اپنے آپ کو ہر شعبہ میں اور

ہر عملی کام میں ناشاد و نامراد پاتا ہے۔

وہ ناتجربہ کار نوجوان جو کچھ حاصل کرتا ہے۔ پہلے کتابوں سے سیکھتا ہے۔ اُس کے بعد اُنہیں تجربات کو مقولہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یعنی اس دنیا میں خصوصاً بنی نوع میں نیکی اور بدی کی تعداد بہت کافی ہے۔ اور اُس کو مدتوں یہ سکھایا گیا ہے۔ کہ وہ بدیوں سے احتراز کرکے اور نیکیوں پر فدا ہو جائے۔ اُن کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دوستوں کے ساتھ محبت اور خوشدلی کا برتاو رکھنا چاہیئے۔ اور دشمنی کے احساسات پر ثابت قدم رہیں۔ اُس کا برتاو ہر ایک سے چاہیئے وہ دشمن ہو یا دوست تمام سے اُس کا سلوک یکساں رہتا ہے۔ سوائے محدودے چند جن سے وہ اُن کی سچائی کی بدولت وہ محبت ہی نہیں بلکہ عشق رکھتا ہے۔ اپنے دشمنوں کو نیک راستہ پر چلنے کے لئے اُن کو برا بھلا بھی کہتا ہے۔ اسی اصول پر وہ آگے قدم اٹھاتا ہے۔ لیکن ہر قدم پر اُس کو ناکامیابی اور نااُمیدی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انسانی طبایعوں کو نظرِ غایر سے دیکھنے کے لئے وہ دوستی میں توازن خیال پیدا کر لیتا ہے۔ وہ اپنی سرد مہریوں کو ملایم بھی بنا لیتا ہے۔ اور اکثر وہ انسانی خوبیوں کو برائیوں کے ابر میں ڈھکا ہوا دیکھتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کی برائیاں سچائی میں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُس کو دنیا میں بہت کم پرہیزگار انسان نظر آتے ہیں جو شاید ہی گناہوں میں نہ ملوث ہوئے ہوں۔ اور چند ہی ایسے باوقعت نظر آتے ہیں۔

جن کی عوام میں شہرت نہ ہوئی ہو۔ ایک متقی اور مقدس انسان میں وہ برائیاں دیکھتا ہے۔ اور ایک مجرم کے چہرے میں اُس کو بھلائیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اُس کو جذبۂ وفا کا یقین ہو جاتا ہے۔ اور اُس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی پاسداری بہت دیر سے شروع ہوئی ہے۔ اُس کی نفرت میں بھی غصہ کا بہت کم عنصر شامل ہوتا ہے یعنی یہ کہ ایک عقلمند کی محبت کبھی کبھی ایک نمونہ کے قابل محبت بھی کہلائی جا سکتی ہے۔ اور یہ وہی شخص ہوتا ہے۔ جو اکثر بُرے اور بدطینتوں سے احتراز کرتا ہے۔

اس محبت کے معاملہ میں ہر وقت اُس پر ایک نیا کیف طاری رہتا ہے۔ اور ہر گھڑی اُس کو یہی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں میری محبت کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ اور جن لوگوں کی یہ عزت نہیں کرتا۔ اُن سے اُس کو یہی توقع ہوتی ہے کہ کہیں اُس کے احساسات کسی زخم سے زیادہ مجروح نہ ہو جائیں۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اُسکو مان لینا پڑتا ہے کہ میں برائیوں اور بدیوں کے خلاف جنگ کر رہا ہوں۔ یہ سمجھکر کہ ان لوگوں کو نیکی کی دیوی سے عشق اور لگاؤ نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں اُن سے لڑائی قبول کر لینا ہی بہتر ہے۔ کتابوں سے سیکھا ہوا فلسفی ہمارے نظریہ سے بہت بلند ہوتا ہے۔ مفلسی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بہت سے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ اور اُس کا اثر بھی اُس پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

لیکن مفلسی سے وہ بلا کسی جھجک اور خطرے کے برابر ملتا ہے۔

فلسفیوں نے مفلسی پر بڑی بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ اور اُس کو جادو فریب رنگ میں پیش کیا ہے۔ ایسے وقت میں اُس کا فخر و غرور خیال کی زد میں آجاتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ دنیاوی خوبیوں یا برائیوں کو وہ خود اپنے آپ میں پیدا کر دے لیکن باوجود اس ترک کے وہ دنیا سے بے تعلقی کی سچی مثال بنلانا چاہتا ہے اور اس کام کو اپنے اوپر مقدم سمجھتا ہے۔ اے مفلسی۔ اے [illegible] زندگی۔ اے مختصر آمدنی بتلا۔ تجھ میں کونسی ایسی بات ہے جس سے عقلمند لوگ تجھ سے گھبراتے ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہوتا ہے کہ تیرے ساتھ ساتھ عادات و اطوار کفایت شعاری اور صحت کے خزانے ہوتے ہیں۔ مسرت آزادی اور بے فکری تیرے دوست کہلاتے ہیں۔ کیا کوئی شخص ان خوبیوں سے متنفر اور اُن سے شرماتا ہے۔ جیسا کہ "سن سنالیس"
تمام کام انجام دینے کے بعد بھی اپنے پیشے پر پشیماں رہا۔ اور مطلق اُس سے شرم نہ کی۔ اس دنیا میں کیا کیا عجائبات ہیں۔ جاری چشمے۔ وادیوں کی سرسبز بوٹیاں۔ کیا ان سے قدرت میں کامل اطمینان پیدا ہو جاتا

"سن سنالیس" پانچویں صدی قبل مسیح کا یہ ایک رومی کاشتکار تھا جو جنگ آزادی کی قیادت میں اُس نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ اپنے ملک کو "ایکوی" کے حملوں سے بچانے کے اُس نے پھر کاشتکاری اختیار کر لی تھی۔

ہے۔ انسانوں کو ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں۔ ہوتی ہے
مگر موقع کے ساتھ اور تھوڑی سی۔

مفلسی! اے پیاری مفلسی۔ تو آ اور میرے پاس جلد آ۔ تو ہی
ہے نہ جبکہ ایک بادشاہ کے بازو کھڑی ہو کر اس کو دیکھتی ہے۔ اور
ایک فلسفی کے قریب جا کر اسرار خداوندی کے رموز اس پر منکشف کرتی
ہے۔ بول کیا تو وہ نہیں ہے۔ ایک غریب شخص یہ تمنا کرتا ہے۔ جبکہ
وہ خراب کھانا کھاتا ہوتا ہے۔ اور یہ انتظار کرتا ہے کہ اے کاش!
میرے اس کھانے کو میرا بادشاہ دیکھ لیتا اور دیکھ کر مجھ پر رحم و کرم کی
بارش برساتا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے غریب ہونے سے تمام دنیا کے
آدمیوں نے مجھ سے مُنہ پھیر لیا ہے۔ اور ایک فلسفی کو یہ حق دیدیا
ہے کہ وہ جس طرح چاہے۔ تنہائی اور کم مائیگی پر تبصرہ کرلے۔ اس کو
ہم بہ طیب خاطر منظور کرتے ہیں کہ فلسفی کی اداکاری اس وقت کیجائے
جبکہ ہم یہ سمجھ لیں کہ ہم لوگ تمام مناظر بخوبی دیکھ رہے ہیں۔ ایسی
حالت میں صبر و تحمل کی موٹی نقاب مُنہ پر ڈال لینا فضول سی چیز
ہے۔ اور اسٹیج پر اس وقت آنا چاہیئے۔ جبکہ کوئی اعتراض کرنے والا
نہ ہو۔ اور جہاں کوئی متنفس بھی محض دیکھنے کی خاطر نہ آیا ہو۔

پس وہ شخص آدمیت سے کوسوں دور ہے۔ جبکہ اُس کی شجاعت
اُس کی خود توصیفی اور خودداری پر غالب آجائے۔ اور وہ ہر طریقے سے
مطمئن نظر آئے۔ اُس کو اپنی موجودہ تکالیف کا احساس نہ ہو جو کہ اسکے

لئے قدرتی اور غیر مرئی ہوں۔ یا کوئی شخص اپنے جذبات کو محض دھوکہ کے جامعہ میں پوشیدہ کر دے۔ افسان جب جذبات کے نرغے میں پھنس جاتا ہے تو وہ خوف و یاس میں غم و غصہ میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ سرے ہی سے وہ تمام دنیا کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور خود اپنے آپ کو ایک نفرت کرنے والا ایک تنہائی پسند اور اور بالکل آزاد خیال تصور کرتا ہے۔ اور آخر میں یہی اس کا نقطہ نظر ہو جاتا ہے کہ وہ ہر شئے کو بُرا بھلا کہے۔ اور یہ تو عوام کے نوکِ زبان ہوتا کہ تارک الدنیا اشخاص یا تو جانور ہوتے ہیں یا پھر خاص ملکوتی صفات کے مالک ہو جاتے ہیں۔ اور رہے بھی یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور دشوار۔ اور اس کی تعریف نا قابل بیان ہے۔

وہ بے صبر اور متلون المزاج افسان جو معاشرہ سے کنارہ کش ہو گیا ہو۔ حقیقت میں وہ ایک سیدھا سادا اور بے لوث آدمی ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے کہ اس نے دنیا کو بلا تجربہ کے شروع کیا ہو۔ اور اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے ہم جنسوں سے کس طرح سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اچھا خدا حافظ:۔

بارھواں خط

دیوانے کتّوں کا خوف

(ایک طنز)

لیون چی الینگ ایک خط فم ہوم کو لکھتا ہے
جو کہ سمرنیل اکیڈمی پیکین کا پریسیڈنٹ تھا

محبت اور بے تحاشا محبت خصوصاً فطری اور مناظر قدرت سے محبت یہ اب اہل انگلستان سے رخصت ہوئی جا رہی ہے۔ جیسا کہ دیگر ممالک میں آئے دن نت نئی بیماریاں اور متعدی بیماریاں پھیلتی رہتی ہیں۔ اسی طرح اب انگلستان بھی ان کا گہوارہ نظر آرہا ہے۔ بارش ایک مدت معینہ تک اور وہ بھی غیر موسم میں ہمارے یہاں چین میں تو قحط پڑ جاتا ہے۔ اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خوف اور وحشت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ہوائیں جب مغربی ریگستان کے بھوسرے سینہ پر سے گذرتی ہیں تو یہی لوگوں کے لئے باد سموم بن جاتی ہیں۔ اور ہزاروں جانوں کو تلف کر ڈالتی ہیں۔ لیکن اس خوش قسمت سرزمین برطانیہ میں یہاں کے باشندوں پر ہوا سے خواہ وہ کسی قسم کی

ہو۔کوئی بُرا اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ لوگ اور صحت و تنو مندی حاصل کرتے ہیں۔ اور کسان ہمیشہ خوش آیند توقعات کے ساتھ تخم ریزی کرتے ہیں۔

لیکن قوم جب تک صحیح معنوں میں حقیقی برائیوں سے آزاد نہ ہوگی اُس وقت تک میرے دوست اس کو اصلی اور سچی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے پاس قحط نہیں ہے۔ کوئی متعدی بیماری کے پھیلنے کا اندیشہ نہیں ہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ جو چیز ہے وہ یہاں کے انسانوں کی بے ترتیبی اور جھیڑیا چال ہے۔ اور یہی چیزیں ہر سال ہزاروں آدمیوں سے اپنا بدلہ لے ڈالتی ہیں۔ یہ اس بُری طرح پھیلتی ہیں جیسا کہ ایک متعدی مرض آناً فاناً میں پھیل جاتا ہے۔ اور ہر طبقہ کے لوگوں کو اپنی سمومیت سے متاثر کر دیتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کونسی قابل تعجب بات ہوگی کہ اکثر لوگ اس بیماری کا نام بھی نہیں جانتے۔ مگر ہاں بیرون ملک کے چند ڈاکٹر اس کو بیماری کا ہوّا کہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی موسم ایسا گذرتا ہوگا۔ جس میں لوگوں کو اس بیماری کے مختلف شکلوں سے سابقہ نہ پڑتا ہو۔ لیکن اگر نظر غایر سے دیکھا جائے تو ان سب کی کہنہ ایک ہی ملے گی۔ ایک زمانہ میں ایک ہوا اڑی کہ یہ بیماری نان بائی کے دوکان سے شروع ہوئی ہے۔ اور جھ پانی والی سستی روٹی کوئی نہ خریدے دوسرے نے کہا۔ یہ غلط ہے۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ایک مدار

ستارہ نکلنے والا ہے۔ اور لوگوں نے یہ بھی مشتہر کر دیا ہے کہ اسی کی وجہ سے بیماری پھیلے گی۔ ایک تیسرے شخص نے جو ان باتوں کو سن چکا تھا۔ اس پر اس قدر خوف طاری ہوا۔ جیسا کہ کوئی شخص سمندر میں ایک کشتی میں بیٹھا ہوا ہو۔ اور وہ کشتی ڈوبنے کے قریب ہو۔ چوتھا شخص جو سب سے زیادہ ڈر رہا تھا اس کو ایک دیوانے کتے کے کاٹنے کا خوف تھا۔ وہ ہر گھڑی اسی سے ڈرتا رہتا تھا کہ کہیں مجھ کو دیوانہ کتا نہ کاٹ لے۔ اس قسم کے خبط میں جب لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو پھر اُن کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ جب سڑک پر چلتے ہیں تو اپنے دائیں بائیں دیکھتے جاتے ہیں کہ کہیں کوئی دیوانہ کتا نہ تک رہا ہو۔ اس زمانہ میں ان لوگوں میں آپس میں گفتگو کا اس سے اچھا کوئی مشغلہ نہیں ہوتا۔ کہ وہ ہر گھڑی غم اور افسوس اور وحشت کو ایک دوسرے پر ظاہر کرتے رہیں۔ یہ واقعی شاندار چیز ہے۔ اور اس کا وجود قریب و بعید پر نہیں۔ کمزور اور مضبوط پر نہیں۔ بلکہ یہ فطرت انسانی ہے کہ جب کبھی کوئی خوف کی بات سنتا ہے تو اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور جہاں کوئی شخص خوف زدہ ہونیکا ارادہ کیا تو فوراً ہی وہ خوف سے متاثر ہو جاتا ہے۔ ہر گھڑی معمولی معمولی باتوں سے کمزور دل و دماغ کے لوگوں پر مایوسی اور نااُمیدی کے آثار طاری ہو جاتے ہیں وہ ایک دوسرے سے اس خوف کی ماہیت نہیں دریافت کرتے۔ بلکہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہتے

ہیں اور یہ تو قاعدہ ہے کہ جب کوئی خبر اڑتی ہے تو پھر اُس کا رکنا محال ہوتا ہے۔ اصلی قصہ تو پس پشت رہ جاتا ہے لیکن اس قصہ کے حواشی زباں زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں۔

اور دیوانے کتے کا خوف یہ خود اپنی جگہ متعدی بیماری ہے۔ اور آج کل تو پوری قوم اس کے پنجۂ اثر میں ہے۔ جس کو دیکھو دیوانے کتے کا خوف ظاہر کرتا ہے۔ ہشیار سمجھدار شہین اور سنجیدہ لوگ بھی جب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو ہر موڑ پر اُن کو یہی خیال گزرتا ہے کہ کہیں دیوانہ کتا نہ آرہا ہو۔ ایسے زمانہ میں حکیم اور ڈاکٹروں کی خوب بن آتی ہے۔ اور زوروں سے سگ گزیدہ کے نسخہ اور اُن کی ادویات کے اشتہار شائع کراتے رہتے ہیں۔ بلدیہ کے افسر کتوں کے لئے مضبوط رسیاں تیار کراتے ہیں۔ اور چند جو بہادر اور شجیع کہلاتے ہیں وہ سر سے لیکر پیر تک کپڑوں میں ڈھکے ہوئے پیروں میں بوٹ اور ہاتھ میں چمڑوں کے دستانے پہنے رہتے ہیں۔ اس خیال سے کہ اگر کہیں راستہ میں مقابلہ کی آبنے تو اپنے بچاؤ کا کافی سامان تیار رہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ہر شخص اپنے بچاؤ کی اچھی خاصی کوشش کرتا ہے۔ اور لوگ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اب دیوانہ کتا ہرگز اُن کے پاس نہ آئے گا اس لئے کہ بچاؤ کے کافی ہتھیار اُس کے پاس موجود ہیں۔

ان لوگون کے پاس۔ یہہ معلوم کرنے کے لئے آیا کتا دیوانہ ہے یا نہیں۔ عجیب عجیب طریقہ ہیں۔ وہ ایسے ہی مماثل ہیں۔ جیسا کہ قدیم

یورپی طریقہ جادوگرنیوں کو پہچاننے کے ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ کیا جاتا تھا کہ مشتبہ عورت کے ہاتھ پیر باندھکر اُس کو پانی میں ڈالدیا جاتا تھا۔ اگر کسی نہ کسی طریقہ سے جادوگرنی تیر کر بچ جاتی تو پھر اُس کو آگ میں ڈال کر جلا دیا جاتا تھا۔ اگر وہ جل جاتی تو سب کو یقین ہو جاتا کہ بے شک وہ جادوگرنی ہے۔ اگر وہ پانی میں ڈوب جاتی تو یہ سمجھ لیا جاتا کہ وہ حقیقت میں بے گناہ ہے۔ بالکل اسی طرح سے اس زمانہ میں بھی ایک کتے کے گرد مجمع جمع ہو جاتا ہے۔ اور ہر طرف سے اُس کو پریشان کرنا شروع کیا جاتا ہے۔ کتا اپنے بچاؤ کی فکر میں اگر ادھر اُدھر منہ مارتا اور اتفاق سے کسی کو کاٹ لیا تو وہ پھر مجرم قرار دیدیا جاتا ہے۔ اگر وہ بھاگ کر اپنی جان بچانے کی فکر کرنے لگا تو پھر اُس کے ساتھ کوئی ہمدردی برتی نہیں جاتی۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ یہ دیوانے کتوں کا خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ ناک کی سیدھ پر بے تحاشہ بھاگتے ہی رہتے ہیں۔

مجھ جیسا آزاد خیال اور غیر ملکی شخص کے لئے جو اُن کی ذہنی تکالیف میں کوئی حصہ نہ لیتا ہو۔ اور نہ اس قومی بیماری کے مدارج کا کوئی خیال کرتا ہو۔ اس سے آپ ایک حد تک بدظن ضرور ہو جائینگے۔ اس قصہ کی اور اس وحشت کی ابتدا سب سے پہلے ایک معمولی چھوٹے کتے سے شروع ہوتی ہے۔ جو کہ اتفاق سے ایک قریبی گاؤں میں پہنچ گیا تھا۔ اور جس شخص نے بھی اس کتے کو دیکھا۔ بس یہی خیال

کرنے لگا کہ وہ دیوانہ ہے۔

دوسرا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک زبردست جفادھری کتا ایک گاؤں میں گھس گیا۔ اور وہاں کی ۵ بطخوں کو کاٹ کھایا۔ ان پانچواں بطخوں پر اس کی دیوانگی کا کافی اثر ہوا۔ اور بطخیں بھی دیوانی ہو گئیں۔ ان کی چونچوں سے کف جاری ہو گیا۔ اور پریشانی و بدحواسی کے عالم میں پانچوں بھی مر گئیں۔ اس کے بعد ایک دیوانے کتے نے ایک بچہ کو کاٹ کھایا۔ بچہ نمک کے پانی میں بہت دیر تک بٹھلایا گیا تاکہ اس پر زہر کا کوئی اثر نہ ہو۔ ابھی تک لوگ ان وجوہات سے خوفزدہ اور کانپ رہے تھے کہ ایک خبر اور اُڑی۔ وہ یہ تھی کہ ایک شخص کو دیوانہ کتا عرصہ ہوا کاٹ کھایا تھا۔ مگر اب اس کا اثر ظاہر ہو رہا ہے۔ اور ابھی چند ہی دن نہیں گذرے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

دوسرا قصہ بڑا دلچسپ گھڑا گیا کہ کیسے ایک شریف کنبہ کا شخص جس کے (۷) چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ سب کے سب ایک پالتو گودکے کتے سے کاٹے گئے۔ جو کہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ ان بچوں کے باپ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اُس نے پانی پینے کے لئے مانگا۔ اور گلاس میں وہی پالتو کتا تیرتا ہوا نظر آیا۔ جب یہ متعدی مرض عام ہو جاتا ہے تو روزانہ صبح نئے نئے واقعات انہی کتوں سے متعلق سننے میں آتے ہیں۔ اور لوگ ان قصوں کو اس قدر ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔ جیسا کہ اکثر بھوتوں اور شیطانوں کے قصے دلچسپی اور انہماک سے سنے جاتے ہیں۔ سنتے

ہیں جیسا کہ اکثر بھوتوں اور شیطانوں کے قصے دلچسپی اور انہماک سے سُنے جاتے ہیں۔ سُنتے تو وہ شوق سے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ڈرتے بھی جاتے ہیں۔ اس طرح سے روزانہ کتوں کے بھی نئے نئے کاٹنے کے فتوحات گھبراہٹ اور بےچینی سے سُنے جاتے ہیں۔ اور کوشش اس بات کی کیجاتی ہے کہ اِن بے سر و پا خبروں کو جس قدر بھی خوفناک بنایا جائے۔ اتنا ہی زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ اور سُننے والوں کو بہت زیادہ لطف آتا ہے۔

ایک دلچسپ قصہ اور سنئے ایک کمزور قلب و جگر کی خاتون شہر میں رہتی تھی وہ اتنی کمزور تھی کہ کتوں کی بھونکنے کی آواز سے بھی ڈر جاتی تھی۔ اور اس قسم کے خوفزدہ ہونے کا واقعہ بدقسمتی سے اُس کو کئی مرتبہ پیش آیا تھا۔ اس پر جناب فوراً ایک قصہ گھڑ لیا گیا۔ پہلے تو یہ مشہور کیا گیا ایک دیوانے کتے نے ایک اعلیٰ طبقہ کی خاتون کو بری طرح سے خوفزدہ کر دیا۔ جب تک کہ یہ واقعات قریبی گاؤں میں پہونچتے۔ اس پر کافی حاشیہ آرائی ہوی۔ گاؤں میں یہ خبر پھیلی کہ ایک نہایت معزز اور باوقار لیڈی کو ایک جفادھری دیوانے کتے نے کاٹ کھایا۔ ان واقعات اور قصوں میں ابھی بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ اور ابھی یہی قصہ دارالسلطنت نہ پہونچنے پایا تھا کہ پورا قصہ نہایت ہی دلچسپ بنادیا گیا۔ قصبہ میں یہ خبر پھیلی کہ ایک معزز لیڈی کو ایک دیوانے کتے نے کاٹ کھایا۔ اُس پہ کتے کے زہر

کا ایسا اثر ہوا کہ اُس کی آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی ہیں۔ اس کے منہ سے پھین جا رہی ہے۔ کتے کے مانند وہ چاروں ہاتھ پیر سے چل رہی ہے اور زور زور سے بھونکتی بھی جاتی ہے۔ اپنے گھر کے تمام ملازمین کو اُس نے کاٹ کھایا۔ اور آخر کار ڈاکٹر کی رائے سے اس کو دو بستروں کے اندر لپیٹ دیا گیا۔ اسی اثنار میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دیوانہ کتا دیوانہ وا تمام شہر میں پھر رہا ہے۔ اور اپنی ناک اور منہ کا دیوانہ ہوگیا ہے۔ اور ہر شخص کو سونگھنے لگا ہے کہ آیا وہ کس کے کاٹا ہے۔ اور کس کو کاٹنا باقی ہے۔ میری زمیندارن ایک نہایت شریف اور اچھے مزاج کی با اخلاق لیڈی ہے لیکن تھوڑی سی خوش فہم بھی واقع ہوئی ہے۔ وہ ہر جھوٹے قصہ کو ہمیشہ سچ سمجھتی ہے۔ ایک دن صبح میری عادت کے خلاف اُس نے مجھے وقت سے پہلے جگا دیا۔ اُس کے چہرہ سے پریشانی اور خوف کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے کہا کہ اگر آپ بچنا چاہتے ہیں تو براہ کرم آپ اندر سے باہر نہ نکلئے۔ اس لئے کہ ابھی حال ہی میں ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا ہے۔ جس سے تمام دنیا کو اپنی حفاظت کا سامان خود کر لینا چاہئے۔

واقعہ یوں ہے کہ ایک دیوانے کتے نے ایک گاؤں میں ایک کسان کو کاٹ کھایا۔ کسان دیوانہ ہوگیا۔ اور ادھر اُدھر خوب اُچھلنے کودنے لگا۔ اسی دیوانگی کی حالت میں وہ وہاں گھس گیا۔ جہاں اُس کے مویشی بندھے رہتے تھے۔ چنانچہ اُس نے ایک نہایت ہی فربہ گائے کو

کاٹ کھایا۔ گائے بھی فوراً ایسی ہی دیوانی ہو گئی۔ جیسا کہ آدمی دیوانہ تھا اُس کے مُنہ سے کف جاری ہو گیا۔ اور اپنے پچھلے پیروں پر کھڑی ہو کر ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ کتّے کی طرح بھونکنے بھی لگی۔ اور بعض مرتبہ تو ایسا ہوا۔ کہ وہ کسان کی طرح گفتگو بھی کرنے لگی یہ سُن کر مجھے تشویش ہوئی۔ اور اس واقعہ کا کھوج دینے لگا تا چا ہا معلوم یہ ہوا کہ میری ملاقاتی زمیندارنی نے یہی قصہ اپنے ایک ہمسائہ سے سُنا ہے۔ اور وہ پڑوسی کسی اور سے سُنا تھا۔ اور یہ تیسرا شخص کسی معزز ہستی سے اس گپ کو سُنا تھا۔ اس قسم کے بہت سے قصّوں کی اگر اصلیت دریافت کی جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ صحیح طور پر سگ گزیدہ اشخاص کی تعداد سوئیں سے ایک بھی نہ ہو گی۔ یہ صرف لوگوں کے ڈرانے اور اُن کو خوفزدہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس قدر زخمی ہوئے اور اس قدر کاٹے گئے ورنہ اُن کی اصلیت کچھ نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ بیمار اشخاص کو قصداً گھبرا دینے کے لئے اور اُن کو صحیح دیوانہ بنا دینے کے واسطے ایسے قصہ اُن کے سامنے سُنائے جاتے ہیں۔ جو حقیقت میں یہ فعل ناروا ہے۔

بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ایسے گڑ بڑ کے موسم میں اگر تین چار اموات واقع بھی ہو جائیں (اور شائد ہم تو رعایت سے بھی واقع نہ ہوں) پھر بھی یہ نہیں خیال کیا جا سکتا۔ کہ کتنے صحیح وسلامت معہ اپنے روپیوں پیسوں کے بیماری سے اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔

اور یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کتنے اس جانور کی خدمت سے سدھار گئے۔ یہ ہی جانور ہے جو رات کے چوروں کو گھر میں نہیں آنے دیتا۔ ظالم لٹیرے اس کی بدولت گھر میں نہیں آنے پاتے۔ بہت سے کمزور لوگوں کی یہ پاسبانی کرتا ہے۔ اور غریب آدمی کے لئے تو کتا اُس کا مددگار اور شریک غم ہوتا ہے۔ وہ کتے سے اپنی داستانِ غم کہتا ہے۔ اور جو کچھ مل جاتا ہے اس پر اس کا مالک اور جانور دونوں قانع نظر آتے ہیں۔

ایک انگریز شاعر کتے کے لئے کہتا ہے کہ وہ شریف اور ایماندار جانور ہوتا ہے۔ وہ تمام جانور جو چراگاہوں میں اور میدانوں میں چرتے ہیں۔ ان تمام سے یہی کتا افضل ترین جانور ہے۔ کتا ہی صرف ایسا جانور ہے۔ جو انسان سے دوستی پیدا کرتا ہے۔ اور اُس سے رفاقت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی جان بھی اس پر سے نثار کر دیتا ہے۔ انسانوں کو خوش کرنے کے لئے وہ اپنی ہر ممکنہ تدابیر سے کام لیتا ہے۔ اپنی آنکھوں سے وہ محبت کے شرارے گراتا ہے۔ اور ہر قسم کی مدد کرنے کو وہ تیار معلوم ہوتا ہے۔ وہ انسان کی خوشی کی خاطر سے ہر قسم کی محنت اور مشقت کریگا اور اپنے اوپر تکالیف کا انبار لگا لیگا۔ قحط، فاقہ، بھوک، تھکاوٹ، غرض سبھی کچھ وہ اپنی مالک کے خاطر برداشت کرلیتا ہے۔ کوئی طاقت اور تکالیف اس کی وفاداری کو اس سے نہیں چھین سکتیں۔ اور کسی غم کی وجہ سے وہ اپنے مالک سے جدا نہ ہوگا۔ اپنے مالک کے بچاؤ اور حفاظت کے لئے وہ اپنی جان

جوکھوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس کا ارادہ مضبوط اور اُس کی محبت میں تصنع اور چاپلوسی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ لوگ کیسے ظالم ہیں۔ جو اس حلیم الطبع جانور کو ٹھوکر لگاتے ہیں۔ اور اُس کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یہ وہی جانور ہے جس نے جنگل چھوڑ کر انسان کی حفاظت کے لئے اپنی جان انسان کے ہاتھ بیچ ڈالا اور وہ لوگ کیسے ناشکر گزار اور احسان فراموش ہیں جو اس کی وفاداری پر شک کرتے ہیں اور ایسے ایماندار جانور پر اعتماد نہیں کرتے۔

اچھا خدا حافظ :۔

تیرھواں خط

"شیابی بو" "سیاہ پوش" اور "چینی فلاسفر"

وغیرہ سب

"کمیں ہال باغ" میں جمع ہوتے ہیں

لیو نچی ائینگی ایک خط فم ہوم کو لکھتا ہے جو کہ سرمونیل لکڈی

پیکن واقع چین کا پہلا صدر تھا

لندن کے باشندے پیدل چلنے کے ایسے ہی مشتاق ہوتے ہیں
جس طرح اپنے یہاں کے لوگ پیکن میں سواری کے شوقین نظر آتے ہیں
اور دوسرے رسوم کے علاوہ موسم بہار میں یہاں خوب چہل پہل ہوتی
ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ گجردم اٹھ کر شہر کے باہر خوشنما باغوں
میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں سب ایک دوسروں کے خوبصورت کپڑوں کو
حسین چہروں کو اور سریلے گانوں کو سنتے ہیں۔ جو خصوصاً اس موقع کے
لئے لوگ پہن اوڑھکر آتے ہیں۔
چند راتوں کا ذکر ہے کہ میں نے اپنے دوست سیاہ پوش کی خواہش

پر اسی باغ کی دعوت کو میں نے اس کے اصرار پر قبول کر لی۔ اور وعدہ بھی کیا کہ کھانا بھی وہیں کھاؤں گا۔ مقررہ دن پر میں اُس کے گھر جا کر چلنے کے لئے تیار ہوا۔ وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ میرے آنے سے پیشتر ہی معزز مہمان میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اس جماعت میں میرے دوست کا حلیہ قابل دید تھا۔ وہ بہت خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں عمدہ پاتابہ مخمل کا واسکوٹ جو بالکل نیا تھا۔ اور بھورے بالوں کی کنگھی شدہ نئی ٹوپی اس خوبی سے پہنی گئی تھی کہ اصلی اور نقلی بالوں میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اُن کے علاوہ ڈلال کی بیوہ بھی وہیں تھی۔ جس کو میرا دوست آنکھوں کے ذریعہ کھا جا رہا تھا۔ اُس کا لباس سبز دمشقی مخمل کا تھا۔ اور ہر اونگلی میں تین تین سونے کے چھلے پہنے ہوئی تھی۔ پھر مسٹر ٹب کا لباس بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ لباس کے لحاظ سے اُن کا درجہ دوسرا تھا۔ یہ مع اپنی لیڈی کے ایک میلے سلک کے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ کچھ حصہ میلی گاج کا تھا۔ جو بجائے ململ کے استعمال کی گئی تھی۔ اور ٹوپی تو اس قدر بڑی تھی کہ جیسے کہ چھتری ہوتی ہے۔

اب دقت یہ پیش آ رہی تھی کہ ہم لوگ کس طرح سے باغ چلیں۔ بیگم ٹب ہمیشہ پانی کو دیکھنا ناپسند کرتی ہیں۔ اور ڈلال کی بیوہ بہت موٹی تازی عورت تھی۔ وہ پیدل چلنے کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس کے کہنے پر ایک گاڑی منگائی گئی۔ اور گاڑی بھی

اس قدر چھوٹی تھی کہ پانچ سواریاں اُس میں نہیں آسکتی تھیں۔ آخر میں طے یہ پایا کہ "مسٹر ٹب" اپنی بیوی کے گود میں بیٹھ جائیں۔ جس کو انہوں نے بہت خوشی سے منظور کر لیا۔

اس طریقہ سے ہم لوگ باغ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ تمام "مسٹر ٹب" ہم لوگوں کی خوشی کو اپنی یادہ گوئی سے مغموم بناتے رہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم چل تو رہے ہیں مگر وہاں کوئی شخص نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ پنیر بیچنے والے بھی نظر نہ آئیں گے۔ اس لئے کہ باغوں میں جمع ہونگی اور اُن سے مسرت حاصل کرنے کی یہ آخری رات ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خواہ مخواہ زحمت اٹھا رہے ہیں۔ اور "مسٹر اسٹریٹ" اور "کروکڈلین" کی شرافت اور معززانہ وقار کو اس طریقہ سے کھو رہے ہیں۔ اسی قسم کی اور پر جوش باتیں وہ راستہ تمام بکتا رہا۔ اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ تکلیف سے بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے پہونچنے سے پیشتر ہی باغ بھر میں روشنی ہوگئی تھی۔ وہاں جا کر ہم نے محسوس کیا کہ ہر شخص توقع سے زیادہ خوش اور بشاش نظر آتا ہے۔ روشنی ہر طرف چمک رہی تھی اور روشنی ہی کے بڑے بڑے درخت بنائے گئے تھے۔ زور دار سریلی موسیقی رات کی خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ چڑیوں کا قدرتی جلسہ ترنم اس موقع پر نمایشی چڑیوں کی آوازوں سے بڑھ نہیں سکتا تھا۔ ہم لوگ ادھر سے ادھر خوبصورت جماعتوں کو دیکھتے پھر رہے تھے۔ ہر طرف مزید ار کھانوں سے میز چنے ہوئے تھے۔ اس وقت میں اپنے آپ کو بہت

خوش قسمت اور الف لیلی کے مصنف کی طرح مسرور نظر آرہا تھا۔ میں اس عیش و مسرت کی دریا میں غرق ہوا جا رہا تھا۔

میں اسی خیال میں آگے بڑھ رہا تھا کہ میری ہم جماعتوں کے ساتھ "مسٹر ٹب" نے مجھ کو روک کر پوچھا کہ ہم شام کس طریقہ سے اور کس خوشی میں بسر کرینگے۔ "مسٹر ٹب" کی بیگم صاحبہ باغ میں بہت ناز و انداز سے چل رہی تھیں۔ جہاں پر اُن کا خیال تھا کہ اُن کے بہت سے چاہنے والے نظر آتے ہیں۔ ولال مرحوم کی بیوہ اس باغ میں پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ وہ ہر جگہ اور ہر مقام کو تعجب کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پانی کے کمالات دیکھنے کی وہ حد درجہ مشتاق تھیں۔ جس کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ وہ کمالات گھنٹہ ادھ گھنٹہ میں شروع ہوں گے۔ صرف اتنی سی بات میں ہم لوگوں میں تکرار ہونے لگی۔ اور ہر شخص چاہتا تھا کہ اُس کی بات اوپر رہے۔ بیگم ٹب نے کہا کہ میں نہیں سمجھ سکتی کہ دنیا کیوں مہذب کہلاتی ہے۔ جبکہ پس پردہ اُن سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہوا کرتی ہیں۔ بعض نے کہا کہ وہ لوگ جو ٹکٹ تقسیم کرتے ہیں اور جن کے سامنے روپیوں کے صندوقچہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی میز سے علٰحدہ نہیں ہوتے۔ اُن کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ تین تین گرم کبابوں کی پلیٹیں اُڑا جاتے ہیں۔ یہ اُس وقت وہ لوگ کرتے ہیں۔ جب کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنا ہمارے لئے ضروری ہے اُن میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خرگوش کے گوشت کو تلی ہوئی

پیازیں اور لطیف کے کباب اور چھوٹے چھوٹے چوزوں کے شوربہ کو کھانا تو در کنار کبھی دیکھ بھی نہیں پاتے ہیں۔ وہ اُن لوگوں کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔

یہ مشکل ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی کی عادات کو بخوبی جان سکے جو اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے ہمیشہ کے ایک بکس میں لیجاتا ہے۔ اور یہ کوشش کرتا ہے کہ اچھے سے اچھے کھانے اُس کو کھلائے جائیں۔ یہاں تک تو ہم سب نے اتفاق کیا۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ مسٹر ب اور اُن کی بیگم صاحبہ کسی حال سے الگ بیٹھنے پر راضی نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ اُن کے لئے بھی ایک مخصوص بکس لیا جائے جہاں سے وہ خود دوسروں کو دیکھیں اور دوسرے بھی اُن کو گھورتے ہیں۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ یہ مخصوص نشستیں عوام کی نظروں کی آماجگاہ بنی رہتی ہیں۔ مگر ایسی نشستوں کا حاصل کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نہ تو ہم لوگوں کے پاس کافی روپیہ تھا۔ نہ لباس اور نہ اُس قابل شکل وصورت ہی۔ ہم لوگوں نے خیال کیا کہ بکس حاصل کرنا چاہیئے۔ اگرچہ کہ وہ کمتر درجہ کے کیوں نہ ہوں۔ یہ ہمارے خیال سے بلند چیز ہے۔

پہلے مسٹر ب اور اُن کی بیگم صاحبہ کا خیال ہوا کہ کمتر درجہ کے بکس لئے جائیں۔ اس لئے کہ اُس میں بیٹھنے والے بھی کمتر درجہ کے لوگ ہیں۔

آخر کار بڑی رد و قدح کے بعد ہم لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ بیوہ کے لئے
کھانے میں خاص انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن بیگم ٹپ کا مزاج ہی نہیں مل رہا
تھا وہ ہر کھانے کو بدمزہ اور غیر لذت بخش کہہ رہی تھیں۔ اُن کے شوہر
نے اپنی بیگم کو اپنی طرف بلایا اور یوں کہنے لگے کہ بیگم جیسا مزیدار کھانا
ہم "نواب کرمپٹ کے" میز پر کھا چکے ہیں۔ وہ بات یہاں کہاں نصیب
لیکن یہاں "بیکس ہال" باغ کے لئے ایسا کھانا بھی کوئی بُرا نہیں ہے۔
یوں تو سبھی چیزیں اچھی بری تھی لیکن شراب تو انتہائی خراب اور خوفناک
تھی۔ یہ کہتے ہوئے بھی وہ گلاس بھر کے چڑھا گئے۔

اس بحث و مباحثہ سے بیوہ اپنے آپ کو بہت زیادہ سنجیدہ بنالی
اُس نے یہ ارادہ کر لیا کہ اب وہ کسی چیز کی تعریف نہیں کرے گی۔ اسلئے کہ
اُس کا مذاق گرا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ وہ سڑے ہوئے دہی اور خراب سے
خراب شراب کی بھی برائی یا تعریف نہیں کرے گی۔ وہ اپنی فطرت سے
مغلوب ہو گئی۔ اور بقیہ تمام رات وہ ادھر ادھر پھرنے پھرانے میں
اور سُننے میں گذاردی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے آپ کو
بھول جایا کرتی تھی لیکن اُس کے احباب پھر اُس کو گھیر کر غم و اندوہ
کے قید خانہ میں بند کر دیا کرتے تھے۔ اتفاقیہ طور پر اُس سے "بکس"
کی خوبصورتی اور اُس کے نقش و نگار کی تعریف اُس کے مُنہ سے
نکل گئی۔ لیکن پھر اُس نے اپنے آپ کو درست کر لیا کہ اُس کو تعریف
اور اطمینان کے کلمات اپنی زبان سے نہ نکالنا چاہئے۔ بلکہ خوف اور

بد مذاقی کا رونا رونا چاہئے۔ پھر یکایک ایک گانے والی کی تعریف اُس کے مُنہ سے نکل گئی۔ لیکن مسز ٹب نے فوراً اس کو ٹوک دیا۔ اور کہنے لگی کہ اس گانے والے میں کونسی خوبی ہے نہ تو آواز ہی قابل تعریف ہے اور نہ گانے کے اُتار چڑھاؤ ہی سے واقف ہے۔

مسٹر ٹب نے اپنی بیوی کی خوش مذاقی اور اس کے قوت فیصلہ کی خصوصاً موسیقی میں تعریف کرنا شروع کی اور یہ ثابت کر دیا کہ اُس کا فیصلہ بہت ہی بنچا تُلا ہوتا ہے۔ پھر اُس کے بعد اپنی بیگم سے انہوں نے گانا گانے کی التجا شروع کر دی۔ کہ اپ اپنی سُریلی آواز سے سامعین کو محظوظ کریں۔ لیکن بیگم نے نہایت متانت سے انکار کر دیا۔ اور کہا پیارے تم کو معلوم ہے کہ آج میری آواز بھاری ہو گئی ہے۔ اور جب کسی کی آواز اُس کے مرضی کے خلاف ہو تو پھر اُس کو اصرار کا موقع نہ دینا چاہئے۔ اس کے علاوہ یہاں کونسے ایسے قدردان اور معزز لوگ بیٹھے ہیں جو میری موسیقی سے لطف اٹھائینگے اور میرے گلے کی داد دینگے۔ یہاں گانا تو ایسا ہی ہے کہ موسیقی کا گلا گھونٹنا ہے۔ اس قسم کی عذرداریوں پر کسی نے توجہ بھی نہیں کی۔ اسلیے وہ لوگ گانے سے خود بھی کافی مسرور ہو چکے تھے۔ لیکن دلال کی بیوہ سے خاموش نہ رہا گیا۔ اُس نے فرمائش سے ناک میں دم کر دیا۔ آخر کار مسز ٹب نے اُس کی بات مان لی اور چند منٹ گنگنانے کے بعد اُس نے ایسی آواز نکالی جو سوائے اس کے شوہر کے اور کسی کو بھی اچھی نہیں معلوم

ہوئی۔ مگر اُس کا شوہر اُس کی اس بے ہنگم آواز پر مسرور نظر آ رہا تھا۔ اُس کا شوہر آنکھیں بند کئے ہوئے۔ اُس کے گانے کی تعریف کر رہا تھا۔ اور میز پر اپنا ہاتھ اس طرح سے پٹک رہا تھا کہ گویا وہ اس کے گانے پر ٹھیکہ کا کام دے رہا ہے۔

میرے دوست آپ کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ہمارے یہاں انگلستان میں جب کبھی کہیں گانا بجانا ہوتا ہے تو لوگ اور حاضرین اس طرح سے خاموش بیٹھتے ہیں کہ گویا وہ پتھر کے مجسمہ ہیں۔ دل سے دماغ سے اعضاء سے بالکلیہ گانا سننے میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اور جس وقت گانا شروع ہوتا ہے تو وہ گانے کے سحر سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر ہم لوگ بہت متوجہ ہو کر گانا سنتے ہیں۔ اور ہم لوگوں پر نہایت خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ ابھی ہم لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہمارے نشست کا نگرانکار ہمارے پاس آیا۔ اور مودبانہ سلام کے بعد کہنے لگا کہ حضور پائی کے کمالات شروع ہوا چاہتے ہیں۔ اس اطلاع پر دلال کی بیوہ خوشی سے صوفہ پر سے اوچک پڑی لیکن پھر اپنی حالت پر غور کر کے وہ خاموش بیٹھ گئی۔ اور اپنے آپکو سنجیدہ بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ ٹب کی بیگم صاحبہ جنہوں نے متعدد مرتبہ اس پائی کے کمالات کو دیکھ چکی تھیں اُس نے بری صورت بنا کر کہا کہ ہماری اس تفریح میں کیوں مخل ہو رہے ہو۔ اُس نے اپنا گانا جاری رکھا۔ بیوہ کے اس اشتیاق پر اُس نے نفرت کی نظر ڈالی

بیوہ کے چہرہ سے بانی کے کمالات دیکھنے کا شوق ٹپک رہا تھا وہ عجب کشمکش میں مبتلا تھی کبھی تو سوسائٹی کے رسم ورواج سے اور کبھی ٹوٹب کی بیگم صاحبہ کے اعتراضات سے اور اُن کے گانے میں مخل ہونے سے ۔ بری طرح سے خجل ہو رہی تھی ۔ ٹب کی بیگم صاحبہ اپنے گانے میں مشغول تھیں ۔ اور ہم سب لوگ خاموشی سے سُن رہے تھے ۔ اور جب بیگم ٹب کا گانا ختم ہوا ۔ کہ اسی اثنا میں پھر وہی ملازم آیا اور کہنے لگا کہ بیگم صاحبہ بانی کا تماشہ ختم ہو گیا ۔

بیوہ نے حیرت سے پوچھا کہ ہائیں کیا بانی کا تماشہ ختم ہو گیا ۔ ملازم نے کہا ہاں بیگم صاحبہ ختم ہو گیا ۔ اس پر پھر بیوہ نے کہا نہیں جی اس قدر جلد کیسے ختم ہو گیا ۔ ایسا تماشہ اس قدر جلد نہیں ختم ہو سکتا ۔ ملازم نے کہا حضور یہ میری زبان میں طاقت نہیں کہ میں آپ کے سوالات کو جھٹلاؤں ۔ میں حضور کے کہنے پر اب جا کر پھر دیکھتا ہوں ۔ یہ کہکر وہ گیا ۔ اور تھوڑی دیر میں پھر واپس آیا اور یہی خبر لایا کہ تماشہ ختم ہو گیا اس خبر سے دلال کی بیوہ پر اور دوسرے حاضرین پر مردنی سی چھا گئی اور ناظرین کے دل اچاٹ ہو گئے ۔ اور ہر ایک دوسرے کو قصوروار ٹھیرانے لگا ۔ آخر کار بیوہ نے اپنا ہی قصور تسلیم کیا ۔ اور اس بات زور دیا کہ گھر واپس چلے جائیں ۔ ایسے وقت میں مسٹر ٹب اور ان کی بیگم صاحبہ نے اس مخصوص کمیٹی کو یہ یقین دلایا کہ نہایت سنجیدہ تماشہ اب شروع ہوا چاہتا ہے ۔ اور اب تھوڑی ہی دیر میں نوجوان لڑکیاں

بگل لیکر اسٹیج پر آئیں گی اور نئے نئے طریقوں سے اُن کو پھونکینگی۔ جو دیکھنے کے لائق منظر ہوگا۔ لیکن اس پر کسی نے توجہ نہیں کی۔

اچھا خدا حافظ :-

(چودھواں خط)

بڑھاپے میں عزیز زندگی کی ہوس

لیوچی لُنگی ہنگیو کو ایک خط ماسکو کے راستے سے لکھتا ہے

عمر۔ کی زیادتی سے زندگی کی مسرتوں میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ زیادہ زندہ رہنے کی خواہش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جوانی کے وہ خطرات جن کو ہم ذلت سے دیکھا کرتے تھے۔ اب بُڑھاپے میں وہی خدشات شدید کا باعث ہوتے ہیں۔ جوں جوں ہم بڑھتے جاتے ہیں ہمارے خطرات و وہموں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہی خطرات آہستہ آہستہ معمولی احساسات میں مُبدل ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح سے تھوڑی سی فانی زندگی مختلف بے فائدہ کوششوں کے سرانجامی میں رائیگاں

ہو جاتی ہے یا یہ نہیں تو سلسل زندگی کے برقرار رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔

یہ بات قابل تعجب ہے کہ ہماری فطرت تضاد واقع ہوئی ہے۔ اور اس سے بڑے بڑے عقلمند بھی نہیں بچ سکتے۔ اگر میں اپنی زندگی کا تجزیہ کروں جو کہ میرے سامنے ہے۔ جس کو کہ میں خوب دیکھ چکا ہوں لیکن پھر بھی اس کے مناظر میرے سامنے پوشیدہ ہیں۔ تجربات یہ کہتے ہیں کہ میرے گذشتہ مسرت تیز واقعات صحیح معنوں میں اتنے مسرت بخش نہ تھے۔ اور احساسات یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ایسا سے قبل ظاہر ہو چکے ہیں وہ اس قدر اپنی جاذبیت کھو چکے ہیں کہ آنے والے واقعات سے اس قدر توقع نہیں ہو سکتی۔۔ احساسات اور تجربات کی جستجو فضول سی چیز ہے۔ اور ان تمام سے امید بہت بہتر شئے ہے۔ یہی امید بعض اوقات اس قدر نظر فریب واقع ہوتی ہے کہ پورے منظر کو قابل دید بنا دیتی ہے۔ اور چند خوشیاں اپنی دلفریبی کی بنا پر مجھ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ اور وہ یہ چاہتی ہیں کہ میں ان کا پیچھا کروں۔ بجنسہٖ اسی طرح سے جبکہ ایک جواری ہر طرح سے ہار جاتا ہے اور نا امید نہیں ہوتا بلکہ یہی سوچتا رہتا ہے کہ ایک مرتبہ اور داؤں لگاؤں شاید قسمت یاوری کرے اور جیت جاؤں۔

میرے دوست! ہم میں زندہ رہنے کی ہوس دن بدن ترقی پذیر ہے۔ اور جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے۔ یہ خواہش ہم میں زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہ خواہش ہم میں کہاں سے پیدا ہوئی کہ ہم زندگی کو زیادہ عرصہ تک برقرار رکھیں۔ یہ جذبہ اس وقت بھی موجود ہوتا

ہے۔ جبکہ اس کی برقراری لاحاصل ثابت ہوتی ہے لیکن یہ فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ نسل انسانی کو برقرار رکھے۔ اور یہ آرزو ہم میں بڑھتی جاتی ہے کہ ہم زندہ رہیں۔ اگرچہ کہ یہ خواہش ہماری مسرتوں میں انحطاط پیدا کر دیتی ہے۔ اور فطرت بھی چاہتی ہے کہ ہم ایسی مسرتوں سے دور ہی رہیں۔ اور تخیلات کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیں۔

زندگی بڈھے کے لئے وبال جان ہوتی ہے۔ جس کا دل شکوک سے بھرا ہوتا ہے وہ موت سے کانپتا ہے۔ مگر اتنا ہی جتنا کہ انسانی تخیل میں آسکے۔ وہ لامتناہی مصائب جس سے کہ کارگاہ فطرت فنا ہوتی رہتی ہے۔ اور بڑھاپے کے وہ دلخوش کن تجربات جس سے اُس کو سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ فوراً اُس غمگین کو اُکساتے ہیں کہ وہ اپنے غموں کو خوش افکاری سے بدل ڈالے لیکن خوش قسمتی سے زلت کی موت کا احساس اُس کو اُس وقت ہوتا ہے۔ جبکہ وہ مصائب سے پرے ہوتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ زندگی اُس کے لئے تکلیف دہ ہو جائیگی۔ زندگی کی ایسے وقت اُس کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں ہوتی اور زندگی اُس کے لئے ایک تخیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

دنیا کی ہر چیز سے ہماری وابستگی اور اُن چیزوں سے محبت اس وقت ہمارے دل میں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ جبکہ اُن چیزوں سے ہم کو زیادہ سابقہ پڑا ہو۔ ایک فرانسسی فلسفی کہتا ہے کہ میں اس کو ہرگز پسند نہیں کرونگا۔ کہ وہ ستون جس کو میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا ہوں گویا اس میں اور مجھ میں

انی دوستی ہو گئی ہے۔ اس کو بے دردی سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے
ب وہ مانع جو ایک عرصہ سے ایک چیز کا عادی ہو گیا ہو۔ فطری طور
وہ اُس کی ہمنوائی کرنے پر مجبور ہو گا اور اُس کے دیکھنے کا اشتیاق
اہر کرے گا۔ وہ اُس قدیم راہ و رسم کے لحاظ سے اُس سے ملتا رہیگا۔
ر اگر کسی وجہ سے اُس کو اُس سے جُدا ہونا پڑے تو طوعاً و کرہاً وہ
ں سے الگ ہونا بھی پسند کرے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک بڈھے
یی کی طرح وہ ہر شئے کو اپنے قبضہ میں کرنے کی فکر کرے گا۔ وہ لوگ
نیا سے اور دنیا کی تمام اشیاء سے محبت کرتے ہیں۔ وہ زندگی سے
ر زندگی کی تمام مہمات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے نہیں
۔ اب بھی وہ کسی قسم کی کوئی خوشی پہونچا سکتے ہیں۔ بلکہ ایک عرصہ
ب اُس کے ساتھ رہنے سے انہیں محبت ہو گئی ہے۔

مقدس شہنشاہ چین "چین واہنگ" جب تخت پر جلوہ افروز
وا۔ تو اس نے اس مسرت میں ایک حکم جاری کیا کہ جو لوگ نا اتفاقی سے
یل بھگت رہے ہیں۔ اور ایک مدت سے حکومت اُن کو قید کیے ہوئی
ہے۔ وہ لوگ سب رہا کر دیے جائیں۔ بہت سے قیدی شہنشاہ کے
س اس رہائی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آئے۔ اُن میں سے ایک
رھا بھی تھا۔ جس نے آتے ہی شہنشاہ کے قدموں پر گر پڑا اور یوں
کہنے لگا کہ اے چینیوں کے مقدس باپ اس بڈھے غریب
بدبخت پر نظر رحم فرمایئے۔ جس کی اب عمر پچیاسی سال کی ہے اور

جس وقت یہ تہ خانہ میں قید کیا گیا ہے اس کی عمر بائیس ۲۲ سال کی تھی اس سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ بلکہ مدعیوں اور دشمنوں کی ریشہ دوانیو نے اس کو قید کرا دیا۔ اور اب اس بدبخت کو تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہوئے تقریباً پچاس سال سے زائد زمانہ گزر گیا۔ اور اب تو بمصداق اس کے ع "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں" وہ آفتاب جس کو کہ ایک دنیا دیکھتی ہے۔ مگر میں اُس کے دیکھنے کو تڑپ گیا ہوں۔ اور اب اس کی کرنیں میری آنکھوں کو اندھا کئے دیتی ہیں۔ میں جب گلیوں میں اپنے دوستوں کی تلاش میں نکلتا ہوں اور اپنے عزیزوں سے ملنا چاہتا ہوں تو مجھے کوئی نہیں ملتا۔

واحسرتا سب دوست عزیز مجھ سے بچھڑ گئے۔ اور ہمیشہ کے لئے مجھ سے رخصت ہو گئے۔ اور میں تمام عمر کے لئے ہر دل سے بھلا دیا گیا۔ اے میرے مہربان شہنشاہ "چین واھنگ" مجھ کو آپ اجازت دیجئے کہ میں اپنی تھوڑی سی بقیہ بدنصیب زندگی کو وہیں تاریک قید خانہ میں گذار دوں۔ مجھے اپنی جیل کی دیواریں آپکے بڑے بڑے عالیشان محلوں سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور اُن دیواروں کے سامنے منقش محلوں کی دیواریں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ اے بادشاہ میری حیات اس وقت بہ مصداق اس کے ع "تھوڑی سی رہ گئی ہے۔ اُسے بھی گذار دے" پس میں اپنی تھوڑی سی بے فائدہ زندگی کو جیل ہی کے نظر کر دینا

ہتا ہوں۔ وہ میرے لیے ایسا محبوب ترین مقام ہے جہاں میں
، اپنے شباب کو الوداع کہا۔ یہ بھی عجیب مذاق ہے۔ آپ مجھے
ترت سے رہا کرنا چاہتے ہیں اور میں اپنی خوشی سے وہیں
یدخانہ میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ اور وہیں اپنی زندگی کو ختم کردینا
ا ہتا ہوں گا۔

اس بڈھے کے خیالات خصوصاً قید و بند کے متعلق جو کچھ
تھے بالکل ویسے ہی ہم اپنی زندگی کے متعلق رکھتے ہیں۔ ہم قید
ں رہنے کے عادی ہیں۔ ہم اپنے اطراف کی ہر چیز کو بے استغنائی
ا نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ہم کو اُن چیزوں سے تشفی نہیں ہوتی
ہم اپنے گھر سے خود بیزار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہماری مدت قید
بڑھتی جاتی ہے۔ اور ہم کو وہی اپنا جھونپڑا بڑا آرام دہ معلوم ہوتا
ہے۔ ہم اُسی کے لئے مشتاق نظر آتے ہیں۔ وہ درخت جن کو ہم بھلاتے
ہیں۔ وہ مکانات جن کو ہم شوق سے بنواتے ہیں۔ اور وہ اولاد
جو بڑی منت و مرادوں سے ہمارے یہاں پیدا ہوتی ہے۔ ان تمام سے
ہمارا قلبی تعلق رہتا ہے۔ اور دنیا میں ان چیزوں سے مفر نہیں۔ اور
جب ہم ان سے چھوٹ جاتے ہیں تو یہی پس ماندے ہماری جدائی پر
نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ زندگی نوجوانوں کے لئے ایک نئی دوستی ہوتی
ہے۔ اُس کے دوست احباب بھی اپنے آپ میں ایک نئی روح اور
نہ تھکانے والی قوت محسوس کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ خوش اور بشاش

رہتے ہیں۔ باوجود اس عیش و مسرت کے کبھی اُن کی پیشانی پر بل نہیں
پڑتا۔ ہمارے لئے ہمارے وہ ساتھی جو آفتاب کو ہو رہے ہیں۔
اور جو کوئی دم میں ڈوبنا چاہتے ہیں۔ زندگی اُن کے لیئے ایک پُرانے
دوست کی مانند ہوتی ہے۔ وہ اپنی اس زندگی پر متبسم ہوتے ہیں۔ اور
تمسخرانہ انداز میں اُس پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اس زندگی میں کوئی
نئی بات اور کوئی چیز قابل ہنسی کے نہیں ہوتی۔ نہ تو اس میں کوئی
ترمیم و تعمیر ہو سکتی ہے۔ اور نہ کوئی نمایاں ترقی ہو سکتی ہے۔ جو لائق
استحباب ہو۔ ان تمام خامیوں کے باوجود بھی ہم زندگی سے اُنس رکھتے
ہیں۔ اُس کا وجود تو مسرتوں سے بہت دور ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی ہم
اُس کو چاہتے ہیں اور اُس پر جان دیتے ہیں۔ وہ کاشتکار جو اپنا خزانہ
اور اپنی کفایت شعاری کے کھلیانوں کے نذر کر دیتا ہے۔ وہ بھی یہی
محسوس کرتا ہے کہ تمام مصائب اور تکالیف ذہنی کا خاتمہ اُسی
وقت ہوتا ہے۔ جبکہ انسان خود دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔

”مسٹر فلپ سورڈ انٹ“ ایک نوجوان خوبصورت بہادر اور
با اخلاق انگریز تھا۔ خوش بختی اور دولت اُس کے قدموں پر
کھیلتی تھی۔ وہ بادشاہ پرست بھی تھا۔ اور کسی حال میں اور کسی
چیز میں وہ کسی امیر و کبیر سے کم نہ تھا۔ دنیا کی ہر تعیشات سے وہ
چھک چکا تھا۔ اور آیندہ بھی دولت اُس کا ساتھ دینے کو تیار تھی۔
وہ بادہ مسرت سے سرشار تھا۔ مگر پھر بھی ایک نہ ایک کھٹک اُس کے

دل میں ہوتی رہتی تھی۔ باوجود ان تمام وافر احتیاجوں کے بھی وہ زندگی سے بیزار تھا۔ اور اس دنیاوی عیش و مسرت کی شاہ راہ پر وہ چلنے سے پرہیز کرتا تھا۔ وہ ہرشئے میں ایک کمزوری اور دنیاوی ہرچیز کو فانی خیال کرتا تھا۔ اُس نے اپنے آپ میں کہا جب شباب میں یہ حال ہے اور دنیا کی کوئی چیز دل لُبھانے والی نظر نہیں آرہی ہے۔ تو بڑھاپے میں کیا حال ہوگا۔ اس وقت جبکہ انسان کمزور اور حواس باختہ ہوجاتا ہے۔ اور یوں تو اس وقت بھی زندگی بیکار اور فضول معلوم ہو رہی ہے۔ آیندہ بھی اس کا یہی حال ہوگا۔ اس بے ثباتی کا خیال ہر گھڑی اُس کے دل پر نقش تھا۔ اور اسی وجہ سے اُس کی زندگی بے کیف تھی۔ بالآخر وہ اس زندگی سے بیزار ہوکر ان خیالات اور مجھے تفکرات کو پستول سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرڈالا۔ کیا ایسا شخص جو اپنے نفس کو دھوکہ دے رہا ہو قابل تعریف ہوسکتا ہے۔ جس کی عمر کے ساتھ ساتھ اُس کے زندہ رہنے اور زیادتی بقا رکی خواہش اُسمیں ترقی پذیر نظر آتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ بڑھاپے کا مقابلہ مردانہ وار بلا کسی جھجک کے کرلے۔ اور زندہ رہنے کی ہوس اُس میں بدرجہ اتم موجود ہو اور اپنے دوست احباب کو اپنی آیندہ خدمات سے خوش کردے لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو بہت سے لوگوں کو اپنا شریک ماتم اور متعدد افراد کو اپنے غم میں روتا ہوا چھوڑ جاتا ہے۔

پندرھواں خط

چند غریب اور مفلس شعرا کے مختصر قصے

جنہوں نے اپنی زندگی یاس و غم میں بسر کی اور مفلسی و تہی دامنی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے

لیون چی الینگی ایک خط فم ہوم کو لکھتا ہے۔ جو کہ سر منیل اکیڈمی پیکن واقع چین کا پہلا صدر تھا۔

مجھے۔ ہر ملک کے شعرا کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے۔ جہاں اس طبقہ پر ہمیشہ مفلسی کا بادل چھایا رہتا ہے۔ اُن لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ موجودہ زمانہ سے بہت محظوظ ہوتے ہیں مستقبل کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ اُن کی بات چیت تو ایک سمجھدار آدمی کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن اُن کے حرکات بے وقوفوں اور بدتمیزوں کی طرح ہوتے ہیں۔ مستقل مزاجی اور ارادہ اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ زلزلہ بھی اُن کو اپنی جگہ سے اکھاڑ نہیں سکتا لیکن احساس اس قدر لطیف ہوتے ہیں کہ معمولی سی چائے کی پیالی کے ٹوٹ جانے سے غمگین ہو جاتے ہیں۔

ں قسم کے عادات و اطوار فطرتاً شعرا میں موجود ہوتے ہیں۔ اور یہی ایک
ہی روشنی ہوتی ہے جس کو کہ امیر لوگ ناپسند کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ
ردکبھی اعلیٰ سوسائٹی میں نہیں جا سکتے۔

مغرب کے شعرا ہمیشہ اپنی مفلسی و تہی دامنی کی وجہ سے مشہور
ہیں لیکن عقل و دماغ میں وہ بہت بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ مشہور ہے کہ
سرمایہ داروں نے غریب لاچار اور مفلس مریضوں کے لئے سینکڑوں خیراتی
شفاخانے بنوائے ہیں لیکن کسی نے مفلس شعرا کے امداد کے لئے کوئی
خیراتی خانہ نہیں قایم کیا۔ صرف ایک سننے میں آیا ہے کہ ایک خیراتی خانہ
ن مفلس شعرا کے لئے قایم کیا گیا ہے۔ اس خیراتی خانہ کو مسٹر لیوپ ارین
شتم نے بنوایا تھا۔ جو صرف غریبوں اور وہ بھی خصوصاً ایسے لوگوں
لے لئے جن کو کہ مفلسی سے سابقہ پڑنے والا ہو۔ یا شعر شاعری کی وجہ سے
مفلس ہو گئے ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس طبقہ کے لوگوں کی حالت
ہمیشہ سقیم ہوتی ہے۔ چاہے وہ مغربی شعرا ہوں یا مشرقی۔ اور میں سمجھتا
ہوں کہ اگر ان لوگوں کی سوانحعمری کے لئے کوئی مواد جمع کیا جائے تو وہ
بہت دلچسپ ہوگا۔ خصوصاً بنی نوع کے مفلسی کی تاریخ زیادہ موثر ہوگی۔

ہومر یہ ایک پہلا شاعر گذرا ہے جو ہمیشہ کوشش یہ کرتا تھا کہ قدیم
شعرا سے اس کی شہرت ہمیشہ بڑھ چڑھ کر رہے۔ یہ اندھا تھا۔ اور ہمیشہ
گلیوں میں نظمیں پڑھکر بھیک مانگا کرتا تھا۔ لیکن یہ آپ خیال کیجئے کہ
اس کا منہ ہمیشہ اشعار اور نظموں سے بھرا رہتا تھا۔ لیکن روٹی سے ہمیشہ

خالی رہتا تھا۔ "پلاٹر" ایک مزاحیہ شاعر تھا اور اس فن میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ اس کے پاس دو طریقے تھے۔ روحانی غذا اور اپنے اطمینان قلب کے لئے اس نے شاعری اختیار کی تھی لیکن زندگی کو باقی رکھنے کے لئے وہ ایک آٹے کی چکی کے کارخانہ میں کام کیا کرتا تھا۔ جہاں پر اُس کو گذر اوقات کے لئے کچھ آٹا مل جایا کرتا تھا۔ "ٹرنس" ایک غریب غلام تھا۔ اور "بوتھیس" بیچارہ مفلسی کے عالم میں دنیا سے سدھار چکا تھا۔ اطالوی شعرا میں "پالو لورگھیس" ہی ایک ایسا شاعر گذرا ہے جو قابلیت اور لیاقت میں "ٹاسو" سے کم نہ تھا۔ اس کو چودہ طریقہ یاد تھے۔ جس سے کہ وہ اپنی روزی کما سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس نے کبھی ایک طریقہ کو بھی استعمال نہیں کیا۔ اور اس مفلسی کے عالم میں مرا ہے۔ جبکہ اُس کے منہ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہیں گئی تھی۔ "ٹاسو" جو کہ تمام شعرا سے بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ جسکی لیاقت علمی کا شہرہ دور دور پر تھا۔ اُس کی بھی یہ حالت تھی کہ وہ اپنی گذر اوقات کے لئے دوسروں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔ کبھی وہ ایک کراؤن اپنے کسی دوست سے قرض لے لیا کرتا تھا۔ تاکہ ایک مہینہ کے لئے گزر اوقات کا سامان ہو جائے۔ اُس نے کئی قطعات لکھکر چھوڑ گئے ہیں کسی ایک میں اُس نے اپنی بلّی کو مخاطب کیا ہے۔ اور اس سے یہ استدعا کی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کی روشنی اُس کو قرض دے دے۔ تاکہ یہ بیٹھکر اُس کی روشنی میں شعر شاعری

کا کام کرینگے۔ اس لیئے کہ اس کے پاس ایک موم بتی خریدنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ لیکن "بنٹی اوگلیو" غریب "بنٹی اوگلیو" جو ہمارے رحم و کرم کا زیادہ مستحق تھا۔ جس کے طربیہ ڈرامے اس وقت تک دنیا میں قائم رہینگے۔ جب تک کہ اطالوی زبان باقی رہیگی لیکن اُس کا زمانہ بھی نہایت فلاکت اور حسرت میں بسر ہوا۔ لیکن کسی زمانہ میں وہ اس قدر مخیر اور شاہ خرچ تھا کہ لوگ اُس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ مگر بڑھاپے میں اُس پر یہ زمانہ پڑا کہ وہ اُس خیراتی ہسپتال میں بھی نہیں شریک کیا گیا جس کو کہ وہ خود بنوایا تھا۔

اسپین میں "سروینٹس" کے متعلق مشہور ہے کہ وہ فاقہ کشی سے جانبر نہ ہو سکا۔ اور اُس کے متعلق بھی بالکل صحیح ہے کہ "کیموئنس" نے اپنے آخری دن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اسپتال میں گزارے۔ اور وہیں اس کا خاتمہ ہوا۔ اگر ہم فرانس کی طرف متوجہ ہوں تو وہاں بھی ہم کو بیسیوں ایسی مثالیں ملیں گی۔ کہ جن کے ساتھ پبلک کی طرف سے نہایت ہی بے رخی برتی گئی۔ "ادگلیس" ایک نہایت ہی سنجیدہ نثر نگار تھا۔ اور اپنے عہد کا نہایت ہی سچا ایماندار شخص تھا۔ جن کو عام طور پر لوگ الو کہا کرتے تھے۔ اس معزز خطاب کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ رات میں باہر نکلا کرتا تھا۔ اور دن میں پوشیدہ رہتا تھا۔ دن میں باہر نکلتے ہوئے وہ اس لیئے ڈرتا تھا کہ کہیں قرضدار اُس کو پکڑ نہ لیں۔ اُس کی آخری وصیت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ اُس نے

وصیت یہ کی کہ باوجود قرض چکانے کے اور قرضداروں کو ادا کرنے کے بھی میرے بہت سے قرضدار باقی رہ گئے ہیں۔ گو میں بہت سے لوگوں کو رقم ادا بھی کر چکا ہوں لیکن پھر بھی اگر باقی رہ جائیں۔ تو یہ میری آخری وصیت ہے کہ جب میں مروں تو میری لاش کسی سیول سرجن کے ہاتھ فروخت کردی جائے۔ اور اُس سے جو کچھ رقم حاصل ہو وہ قرضداروں کو دے دی جائے۔ اس لئے کہ سوسائٹی میں کوئی شخص مجھ پر اُنگلیاں نہ اُٹھائے۔ اور مرنے کے بعد بھی میں دوسروں کے کام آسکوں۔

ایک فرانسیسی شاعر "کیسنڈری" جس کی لیاقت کا لوہا ایک عالم مانتا تھا۔ باوجود اُس کی قابلیت کے پھر بھی وہ اپنی زندگی کو گذار نہیں سکتا تھا۔ جب اُس پر ڈگریاں آنا شروع ہوئیں تو لوگوں نے اُس کو نفرت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا اور اُس پر کسی نے بھی رحم و مہربانی کی نگاہ نہیں ڈالی۔ وہ کوشش یہ کرتا تھا کہ اُس کی تکالیف اور غموں کا خاتمہ ہو جائے۔ اور اُس کے پاس کچھ بھی پس انداز ہو جائے اُس کے نزاع کے عالم میں جبکہ مقدس پادری اُس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اُس پادری نے اس سے خواہش کی کہ وہ اس آخری وقت میں خدا کو یاد کرے اور اُس کے انصاف کا خواہاں ہو۔ اُس نے نہایت ہی ترش روئی سے کہا کہ ابتک خدا نے میرے ساتھ کیا انصاف کیا۔ جو مرنے کے بعد میرے ساتھ انصاف کرے گا لیکن جواب

دیتے ہوئے اُس کے دل میں شک و شبہات کا انبار لگا ہوا تھا۔ اور
اُس کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ اور نہ کوئی ایسی دوا تھی جس سے اُن
شبہات کو زائل کرتا۔ مرنے والے نے کہا اے مقدس پادری میں آپ
سے التجا کرتا ہوں کہ میرے لئے آپ دعا کریں کہ میرا باپ میرا بیٹا اور
اور میرے احباب مجھکو معاف کر دیں۔ اور مجھ سے نیکی کا برتاؤ کریں
اُس پر اُس نے کہا کہ آپ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب ہے لیا۔
تم کو معلوم ہے کہ خدا نے مجھکو کس حالت میں اس دنیا میں بھیجا تھا
تھا کہ میں اپنی زندگی بسر کروں۔ اور وہ دنیا جس پر لا کے چھوڑ دیا
گیا تھا وہ میرے لئے تنگ کر دی گئی تھی اور یہ آخری وقت بھی
دیکھ رہے ہو کہ کس کس بیکسی کے عالم میں جان دے رہا ہوں لیکن
یہاں کے شعرا کی تکالیف اور اُن کی مصیبت کو کسی اور ملک سے
ملایا جائے تو وہاں کی کوئی حقیقت نہ ہوگی۔

"اسپنسر" "اوٹاوے" "بٹلر" "ڈرائی ڈن" یہ ایسے شعرا ہیں
جن کو قوم نے نہایت ذلیل کیا۔ اور اُن کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ کی
بہت سے نہایت ذلت کی حالت میں راہی عدم ہوگئے۔ اور بیسوں
بھوک سے بیتاب ہو کر مر گئے۔

اب موجودہ انگلستان میں چند شعرا ایسے بھی رہ گئے ہیں جن کی
حالت بہت سقیم ہے۔ اُن کے کوئی سرپرست نہیں ہیں۔ بلکہ وہ عوام
کی سرپرستی پر پل رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ جو کچھ بھی سلوک ہوتا ہے وہ

اُس کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اُن کی قابلیت کے مقابلہ میں
اُن کے ساتھ انصافانہ سلوک نہیں ہوتا۔ لیکن اُن کی گذر اوقات
کے لئے جو کچھ اُن کو مل جاتا ہے وہی بہت ہے۔ وہ کام جس سے کہ
شہرت حاصل ہو یہ اُس کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ قابلیت کا ہی ہو۔ کبھی
اُس لیاقت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وقت ایسی چیز ہے کہ وہ ان تمام
کی کسوٹی کہلا سکتا ہے۔ اور اس کسوٹی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ کون
مصنف لایق ہے۔ اور کون جاہل۔ اور کون شخص ایسا ہے جو ترقی کی
کوشش کر رہا ہے۔ اور کس شخص کا کام دوامی زندگی کا مرہون منت
ہو سکتا ہے جس کو لوگ شوق سے پڑھیں۔ اور کم سے کم دس سال
تک اُس کو اپنے اپنے دلوں سے محو نہ کر دیں۔ آج کل ایک مصنف
کی حیثیت جس کے کام کی ہر طرف شہرت ہو۔ اُس کی صحیح معنوں میں قدر
ہو سکتی ہے۔ ہر وہ سنجیدہ شخص جو کہ ایک سوسائٹی کا فرد ہو جب وہ
کسی قابل شخص کی کتاب کو خریدتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس
کی مدد کرتا ہے۔ گذشتہ زمانہ میں تہ خانہ (گیارٹ) میں رہنے والے
مصنفوں کو لائق سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اُنکی کی عزت ایک عرصہ تک
اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ وہ غریب ہوتے تھے لیکن اب اس کے
برخلاف آج کل کے مصنفین اپنی لیاقت سے مالدار بن سکتے ہیں۔
اور اگر اُن کے دل و دماغ کو اُن کی قسمت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بہت
کچھ اپنی کارگذاری بتلا سکتے ہیں۔ اور وہ لوگ جن میں کہ کوئی قابلیت

د تو اُن لوگوں کے لئے یہ موزوں ہے کہ وہ ہمیشہ قعرِ گمنامی میں پڑے
ں۔ وہ شعرا یا مصنّفین جو اپنے سرپرستوں کی وجہ سے پل رہے ہیں۔
اپنے مربیوں سے ڈرتے بھی بہت ہیں۔ وہ کسی دعوت میں بلا اپنے
رپرست کے مرضی کے نہیں جاتے اُن کو خیال یہ لگا رہتا ہے کہ کہیں ہمارے
رپرست ہم سے ناخوش نہ ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ گھر ہی میں رہ کر
نہ کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ ایک مجمع میں اُسی کپڑے ول میں آتے
ں۔ جیسا کہ عوام پہنتے ہیں لیکن اُن کا دماغ شاہانہ اور اُن کی بات
بت اعلیٰ ہوتی ہے۔ اور جو کچھ بھی وہ بات چیت کرتے ہیں اُس سے
ترشح ہوتا ہے کہ وہ عقلمندی اور متانت سے کوٹ کوٹ کر بھری
ئی ہے۔ ایسے موقع پر وہ اپنی قسمت پر ناز نہیں کرتا۔ لیکن وہ اپنی
ادمی کی شان وشوکت کو برقرار رکھتا ہے۔ اور آزاد ہی رہتا
ہتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔

(سولھواں خط)

پشیمان شباب

یا

(خاتمہ)

لیوچی الیشگی ایک خط فم ہو تم کو لکھتا ہے۔

ستعدد۔ مایوسیوں کے بعد آخر کار میری امیدیں بر آئیں میرا لڑکا جسکی آمد کا میں ایک عرصہ سے منتظر تھا وہ یکایک میرے پاس آگیا میرے شک وشبہات اس کی آمد کی خوشی میں سب کافور ہوگئے۔ اس کی تہذیب وشایستگی اس کے سلجھے ہوئے خیالات اس کی گرمئی کلام سے میں یعنی اس کا باپ بہت خوش ہوا۔ میں اس کو لڑکا چھوڑ کر آیا تھا۔ مگر اب وہ بھرپور نوجوان ہے۔ اس کے سفر کی صعبتوں اور موقتی تکلیف کو دور کرنے کے لئے اس سے خوش خوش باتیں کرنی پڑیں۔ اس کی محبت میں ناکامیابی کی وجہ سے وہ کبھی کبھی دوران گفتگو میں غمگین ہو جاتا تھا۔ ہم دونوں کی گفتگو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے انہیں خیالات کے تحت غیر اطمینان بخش ہو رہی تھی۔ اس قنوطیت کا علاج میرے بس سے باہر تھا۔ لیکن میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اگر قسمت میں ہے تو وہ پریوش ضرور اس سے ہم آغوش ہوجائیگی۔

میرے لڑکے کے آنے کے دو دن کے بعد "سیاہ پوش" معہ اپنی

نوجوان بھتیجی کے میرے پاس مجھ کو اس موقع کی مبارکباد دینے کے لئے
آیا کہ باپ بیٹوں کی دیرینہ ملاقات مبارک ہو لیکن آپ خیال کیجئے تعجب
ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ خوش بھی ہوئے کہ سیاہ پوش کی بھتیجی ہی میرے
لڑکے کی غارت گر عقل و ہوش تھی۔ اور اسی نے میرے لڑکے کو اپنی
دام زلف کا اسیر بنا لیا تھا۔ یہ لڑکی ایران سے دریائے والگا میں
سفر کرتے کرتے طوفان میں گھر گئی۔ اور اس کی کشتی پاش پاش ہو گئی۔
کسی نہ کسی طریقے سے وہ تختہ پر بہتی ہوئی نکلی اور روسی دہقانوں نے
اس کو آرکچل کے ساحل پر پکڑ کر آئے۔ اے کاش اگر میں ناول نویس
ہوتا تو اس وقت ان دونوں کی غیر متوقع ملاقات اُن کے جذبات اور
اُن کے اشتیاق کو کس قدر اعلیٰ ترین زاویہ نگاہ سے دکھا کر بیان کرتا
کہ ناظرین بھی عش عش کرنے لگتے۔ بغیر میری مدد کے اُن دونوں کی گرم
ملاقات اُن کی مسرت اُن کی وارفتگی اُن کا جذبہ شوق بے کیف میرے
پاس اس کے بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ اور نہ الفاظ اس
سچی محبت کے مفہوم کو ادا کر سکتے ہیں۔

جب کبھی ایک نوجوان جوڑا آپس میں محبت کی آگ میں جلتا
ہوا نظر آتا ہے۔ تو اس وقت مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جبکہ
ان دونوں میں رشتہ اتحاد و الفت مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس سے کچھ
بحث نہیں کہ ان دونوں جماعتوں سے میری کچھ شناسائی بھی ہے یا
نہیں لیکن جب دو دل دوامی محبت کی زنجیروں میں جکڑ جاتے ہیں

تو یہ دیکھکر میں انتہائی مسرور ہو جاتا ہوں خلقی طور پر میں دو دلوں کا جوڑنے والا واقع ہوا ہوں۔ اور قدرتی طور پر انسانوں کو خوش کرنیکے لئے اور اُن سے ہمدردی کرنے کے لئے مجھے قدرت نے ایک خاص دل عطا کیا ہے۔ اس خوشی میں فوراً میں نے "سیاہ پوش" سے مشورہ طلب کیا۔ کہ کیوں نہیں ہم دونوں اس نوجوان جوڑے کو دائمی محبت کے آغوش میں دیدیں۔ "سیاہ پوش" خود اس موقع کا منتظر تھا۔ اُس نے بھی فوراً اجازت دیدی کہ جلد از جلد شادی ہو جانی چاہیئے۔ چنانچہ دوسرا دن مقرر ہوا۔ اور شادی کے رسوم کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

میرے جتنے ملاقاتی یہاں فراہم ہو سکتے میں نے ان سب کی دعوت دیدی "مسٹر لو" گویا تمام محفل شادی کے منتظم تھے اور "مسٹر ٹویٹ" ہر رسم کو ٹھیک ٹھیک طور پر اور آرائش کے ساتھ ادا کرنے پر مقرر ہو گئیں۔ سیاہ پوش اور ایک دلال کی "بیوہ" دونوں اس موقع پر بہت زیادہ خوش نظر آرہے تھے۔ "مسز ٹب" کی رائے پر بیوہ بہترین ملبوسات میں نظر آرہی تھی۔ اور اس کے عاشق نے بھی اپنی وِگ میں یعنی بالوں کی ٹوپی میں ایک چوٹی کا اور اضافہ کر لیا تھا۔ اور "مسٹر ٹپ" سے یہ چوٹی مستعار مانگی گئی تھی۔ محض اس لئے کہ عاشقی کے سب حربے ٹھیک ٹھیک ہوں۔ سب لوگ جمع تھے اور تمام خوش تھے کہ آج دو دو شادیاں ہو رہی ہیں۔ جب تمام رسوم ادا ہو چکے تو میں نے دیکھا کہ میرے دوست اور اُن کی محبوبہ کے درمیان حجابات کے پردے اٹھ چکے

ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے پہ والہ و شیدا ہوے جاتے ہیں۔
بعض وقت وہ مجھ کو دھکا دیکر پوچھتا کہ کیوں دوست ہماری شادی
بعد از وقت تو نہیں ہو رہی ہے۔ اور دیکھو ہم ہوتے تو انتظار نہیں کرتے
ہیں۔ کہئے آپ کی کیا رائے ہے لیکن میں اپنے متعلق یہ خیال کرتا ہوں کہ
میں بے وقوفی کی اچھی اداکاری کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی سمجھ رہا ہوں کہ
میں اچھا خاصہ بے وقوف بنایا جا رہا ہوں لیکن اس پر بھی میرا خیال
ہے کہ بعض دوست احباب میری اس عقلمندی کی داد دینگے۔ اور
میں دوسروں کے لئے قابل مثال ٹھیرونگا۔

کھانے پر ہر چیز موجود تھی۔ اور سب ہنسی خوشی سے کھا پی رہے
تھے۔ ہر شخص اپنے آپ کو مسرور محسوس کر رہا تھا۔ اور ہر لطیفہ پر فلک
شگاف قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ سیاہ پوش اپنی محبوبہ کی بازو پکڑے ہوا
تھا۔ نئی نئی تازہ ڈیشیں کھانے۔ خاص طور پر اس کی طرف بڑھا
رہا تھا۔ عمدہ عمدہ مشروبات گلاس میں بھر بھر کے پیش کر رہا تھا۔
اور دونوں میز کے نیچے گھٹنے سے گھٹنا بھڑائے ہوئے تھے۔ اور میز کے
اوپر ایک دوسرے کی کہنیاں آپس میں لطف اندوز ہو رہی تھیں
سیاہ پوش نے نوجوانی کی ترنگ میں آکر چپکے سے اپنی بیگم کے
کان میں کچھ کہا۔ اس پر اُن کی بیگم صاحبہ جن کو نوجوانی کا مغالطہ
تھا۔ اپنے ڈھیلے ہاتھوں سے سیاہ پوش کے رخسار پر ایک ہلکا سا
طمانچہ جما دیا۔ ایسی خوشی۔ ایسی وارفتگی ایسی محبت ایسی بہار ایسی

ترنگ اور یہ جوش و خروش کہیں کبھی کسی بڈھے جوڑے میں نہ نظر آیا ہوگا۔ جیسا ان دونوں کے درمیان کھانے کے میز پہ ہو رہا تھا۔

کھانے کی قسموں کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں ایک لذیذ ٹرکی دم دیا ہوا۔ دلال کی بیوہ کے سامنے رکھا گیا۔ جو سیاہ پوش کی معشوقہ بنی ہوئی تھی۔ یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ انگریز ہمیشہ کاٹکر کھایا کرتے ہیں۔ میرے دوست نے اپنی ہونے والی بیگم صاحبہ سے کہا کہ آپ اس ٹرکی (مرغ) کو کاٹنے میں مدد دیں۔ بیوہ اس سے خوش ہوگئی کہ کبھی نہ کبھی آج اپنی ذہانت بتانے کا موقع ملا ہے۔ اور یہ ایسا فن تھا کہ جس کو خود بیوہ نے اپنی دلچسپی سے حاصل کیا تھا۔ چنانچہ بیوہ نے کہا۔ میں خوب کاٹنا جانتی ہوں۔ یہ کہکر اس نے ابتدا ٹانگ سے شروع کی۔ میرے دوست نے ٹانگ کاٹتے ہوئے دیکھ کر کہا کہ اگر مجھ سے کوئی کاٹنے کی فرمائش کرتا تو میں بسم اللہ پہلے بازو سے شروع کرتا۔ اس سے یہ ہوتا کہ ٹانگ بڑی آسانی سے جدا ہو جاتی۔

بیگم نے کہا آپ مجھے اپنی خوشی پر چھوڑ دیجئے۔ میں پرندوں کے گوشت کاٹنے میں ماہر ہوں۔ میں ہمیشہ پہلے ٹانگ سے شروع کیا کرتی ہوں۔ میرے دوست نے کہا۔ بیگم آپ سچ کہتی ہیں۔ مگر بازو بہت آسانی سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں تو ابتدا ہمیشہ بازو سے ہی کرتا ہوں۔ بیگم نے کہا جناب جب آپکا مرغ ہو تو

آپ اس کو جس طرح سے چاہیں کاٹیں مگر براے خدا باقی مجھے پریشان
مت کیجئے۔ اور مجھے اجازت دیجئے کہ میں ٹانگ سے ابتدا کروں
میں امید کرتی ہوں کہ اس بارے میں آپ مجھے تشفی بخش جواب مرحمت فرمائینگے۔
مگر میرے دوست نے کہا بیگم ہم اس قدر بیوقوف نہیں ہیں کہ کوئی ہم کو
مشورہ دے۔ پڑھا کون پڑھا۔ جناب کیا آپ نے سنا نہیں۔ یہاں
کون پڑھا ہے۔ اچھا جناب میں ہی پڑھی ہوں [illegible] اگر یہی ترتیب
میں مرونگی تو بہت سے لوگ خوب اور دوست کا پتہ لگینگے۔ اگر ٹانگ
برابر نہیں تم رہی ہے تو لیجئے اپنے ترکی مرغ کو آپ خود کاٹ لیجئے۔ میرے
دوست نے کہا بیگم آپ اس قدر غصہ کیوں ہو رہی ہیں۔ میں ٹانگ
یا بازو کو بال برابر بھی نہیں گنتا۔ اگر آپ پہلے ٹانگ سے ابتدا کرنا
چاہتی ہیں تو آپ کو پھر دلائل پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جیسا
آپ چاہیں ویسا آپ کریں۔ میں بھی آپ کی خوشی میں شریک ہوں
بیوہ نے غصہ سے چلا کر کہا کہ کیا کہا آپ نے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں
اس کو اپنی جوتی برابر بھی نہیں سمجھتی ہوں کہ تم پہلے ٹانگ لینا چاہتے
ہو یا بازو۔ لیکن جناب یہ بہتر تھا کہ ہم آیندہ سے دور ہی رہیں۔
اس پر سیاہ پوش نے کہا کہ میں کب آپ کی پروا کرتا ہوں میں خود
آپ سے دس ہاتھ دور رہونگا۔ اور یہ ہے بھی کونسا مشکل کام۔ صرف یہی
تاکہ میز کی اس طرف نہیں بلکہ اس طرف۔ اچھا بیگم اس تکلیف دہی
کی معافی چاہتا ہوں۔ میں ہوں آپ کا وہی قدیم تابعدار معاف کیجئے۔

افسوس قدیم دوستی دیرینہ محبت کا یوں چشم زدن میں خاتمہ ہوگیا۔ اور اس قسم کے ترش سوال و جواب کی وجہ سے معزز خرمن رسم و محبت یوں ہمیشہ کے لئے جلکر فنا ہوگیا۔ بعض مرتبہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے معاہدات پر اثر پڑ جاتا ہے۔ اس بدمزگی کا اثر اُس نوجوان جوڑے پر کچھ نہیں ہوا۔ وہ لوگ شراب عشق و محبت کے سرور میں گم تھے۔ اس کے بعد میں اُس نوجوان لڑکی کے چہرہ پر نظر ڈالا۔ جس پر اس نوک جھوک کا ذرہ برابر بھی اثر نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد شادی اور خوشی کے تمام تاثرات فنا ہو چکے تھے۔ البتہ ایک دوسرے سے سب خوش خوش تھے۔

میرا لڑکا اور اس کی محبوبہ ہمیشہ کے لئے دونوں ساتھی بن چکے تھے۔ سیاہ پوش نے اس مسرت میں اپنی بھتیجی کو ایک جائداد بھی لکھدی۔ جس سے اُن دونوں کی خوشی میں اور اضافہ ہوگیا۔ مگر یہ مسرت اُس عشقیہ محبت کی ہم پلہ نہیں ہوسکتی۔ میں وہاں سے اُٹھکر چل دیا۔ اس لئے کہ دنیا کا ہر شہر میرا ہے۔ اور میں وہاں کا باشندہ ہوں۔ مجھے اس کا مطلق خیال نہیں ہوتا کہ صبح کہاں بسر ہوتی ہے۔ اور شام کہاں۔ اب میں نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ میں اپنی آیندہ زندگی شہروں کی تحقیقات اور وہاں کے باشندوں کے دیکھنے بھالنے میں صرف کردوں۔ سیاہ پوش میرا ساتھی اور میرا دوست بن چکا تھا۔ ہم دونوں آپس میں ایک دوسرے سے مقدس کن فوشس“

(جو کہ ایک چینی فلاسفر اور مقدس بزرگ گزرا ہے) کے اقوال بیان کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ وہ ایک مقام پر کہتا ہے۔ "جو شخص خوشی اور مسرت میں تکالیف کا احساس نہیں رکھتا ہے۔ صحیح معنوں میں وہ عقلمند ہے۔ اچھا خدا حافظ :۔

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پریس
چار مینار حیدرآباد دکن